افسانے راجستھان کے

ترتیب و تہذیب

عارفہ سلطان

ناشر

راجستھان اردو اکادمی

افسانے راجستھان کے

ترتیب و تہذیب

عارفہ سلطان

ناشر

راجستھان اردو اکادمی

جے۔۳۔ سبھاش مارگ سی اسکیم جے پور۔ فون۔ ۳۸۱۳۹

سلسلۂ مطبوعات راجستھان اردو اکادمی نمبر ۷۵

نام کتاب ـــــــ افسانے راجستھان کے
نام مرتب ـــــــ عارفہ سلطان
مطبع ـــــــ ثمر آفسیٹ پرنٹرس۔ دلی
سنِ طباعت ـــــــ ۱۹۹۶ء
کتابت ـــــــ مُرلی دھر اروڑا (ٹونک)
تعداد ـــــــ پانچ سو
قیمت ـــــــ سو روپے

پیش لفظ

جب بھی وقت نے کروٹ لی ہے مقصدیت کے حصول کے لئے نئے خطوط اُبھر کر سامنے آئے ہیں اور اُن سے نئی راہوں کی نشان دہی بھی ہوئی ہے۔ اردو زبان وادب کے تحفظ اور ترقی کا سوال آج طرح طرح کی پریشانیاں اور ذہنی اُلجھن لے کر سامنے کھڑا ہے۔ سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ یہ سوال لسانی اور تہذیبی حیثیت سے کم اور سیاسی پس منظر میں زیادہ اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ اس سوال کے ساتھ کچھ اہم سوال بھی جڑے ہوئے ہیں۔ میری نظر میں وہ ہیں

اُردو زبان وادب کی ترقی اور تحفظ کون نہیں چاہتا ؟

کون اس کے لئے فکر مند ہے ؟

کون اس کے لئے فکر مند نہیں ہے ؟

اردو ایک زندہ زبان ہے، کروڑوں انسان اسے بولتے اور برتتے ہیں، ہمارے ملک میں اردو رسائل واخبارات کثیر تعداد میں چھپ رہے ہیں۔ آج بھی مشاعرے فروغِ ادب اور تشہیر زبان کا مؤثر ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ میرے تئیں حقیقت کچھ اور ہی ہے، جس تعداد میں اُردو زبان میں کتابیں، اخبار اور رسائل چھپ رہے ہیں اُس کے لئے ادب کے قارئین کا ایسا وسیع حلقہ آج موجود نہیں ہے۔ ادب کا مطالعہ آج ذہنی، جذباتی تسکین کا محبوب وسیلہ نہیں رہ گیا ہے۔ عام اردو پڑھنے والے تنقیدی مضامین یا تذکرے پڑھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے، میری ذاتی رائے یہی ہے۔ میں یہ تحریر کرتے ہوئے فکر مند ضرور ہوں کہ اردو زبان کا مستقبل کیسا ہوگا۔ ادب کے مطالعہ کا ذوق وشوق کم ہوتا نظر آرہا ہے اور نئے معاشرے کا مصروف آدمی تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ اپنے فرصت کے چند لمحات میں اُن کتابوں اور رسائل کو پڑھنا نہیں چاہتا جو اسے ذہنی تسکین اور سکون نہ دے سکیں۔

اُردو ادب میں افسانہ نگاری نے اُن رجحانات کی تلاش کرلی ہے جو آج کے قاری کو مطلوب و

مرغوب ہیں۔ افسانوی ادب سماجی حالات، زندگی کی کشمکش، تصادم اور گرد وپیش کے ماحول سے اپنا دامن بچاکر نہیں چل سکتا، افسانہ نگاری باریک بینی کی متلاشی ہوتی ہے، جب باریک بینی سماج کی جانب ہوتی ہے تو ایک افسانہ نگار حالاتِ زندگی کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے دور کی عکاسی اپنے افسانہ کے ذریعہ کرتا ہے۔

اگر فن شاعری پیچیدہ فن ہے تو فن افسانہ نگاری بھی کم پیچیدہ نہیں۔ دونوں اصناف زندگی کی وسیع اور سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ عام طور پر ایک افسانہ نگار اپنے دور کے ماحول کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے جسے وہ اپنے افسانوں میں جذب کر دیتا ہے، اس طرح افسانہ یقیناً اپنے عہد کا، سماجی نظام کا آئینہ بن جاتا ہے۔

عارفہ سلطان صاحبہ کا مقدمہ جو ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے افسانہ کے ارتقاء پر ایک جامع مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے اور محترمہ کی طرزِ تحریر کا خوبصورت نمونہ ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں راجستھان کے اہم اور معروف افسانہ نگاروں کا ایک ایک منتخب افسانہ شامل ہے جس کا مطالعہ نہ صرف دلچسپی کا سبب ہوگا بلکہ راجستھان میں افسانہ نگاری کے ناہموار سفر میں ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔ کالج اور گھر کی ذمہ داریوں سے وقت نکال کر دل جمعی کے ساتھ ادبی کام انجام دینا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ دردِ سر بھی ہے۔ یہ کام ہرگز پایۂ تکمیل کو نہ پہونچتا اگر عارفہ سلطان صاحبہ اس کام کو ادبی خدمت کے طور پر نہ کرتیں۔ راجستھان اردو اکادمی محترمہ کے اِس تعاون کے لئے ممنون ہے۔

راجستھان اردو اکادمی نے اپنے اشاعتی منصوبوں میں پچھلے کئی سالوں سے مختلف اصنافِ ادب کے انتخابات ریاستی سطح پر شائع کئے ہیں یہ اُسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔ ان مختصر کلمات کے ساتھ یہ افسانوی مجموعہ قارئین کی نذر ہے۔

عبدالغفار
چیرمین
راجستھان اُردو اکادمی جے پور

فہرست

مقدمہ

"افسانے راجستھان کے"

اردو شاعری میں جو اہمیت غزل کو حاصل ہے اردو فکشن میں وہی اہمیت افسانہ کو حاصل ہے۔ اردو افسانہ نے دیکھتے ہی دیکھتے انتہائی ترقی کو لی اور اردو کے افسانہ نویسوں نے تخلیق کی اعلیٰ ترین بلندیوں کو چھو لیا۔ کہانی انسان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ ایک پیڑھی کو دوسری پیڑھی سے جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ انسان کی تاریخ جتنی پرانی ہے کہانی کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے۔

قصہ گوئی کی ابتداء اس وقت ہوئی جب انسان کے پاس فرصت کے لمحات لامحدود تھے۔ عملی دنیا میں انسان جو کام نہیں کر سکتا تھا، تخیل کی دنیا میں وہ ان کاموں کو بڑی آسانی سے کر لیا کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے انسان کے پاس فرصت کے لمحات کم ہوتے گئے لیکن اس کا کہانی کہنے اور سننے کا شوق ختم نہیں ہوا۔ ذہنی اور جسمانی تھکن سے وقتی فرار کے لئے کہانی کو دلچسپ انداز میں پیش کیا جانے لگا۔ تاکہ انسان اس سے لطف اندوز ہو سکے۔ انسان نے جب اپنی دن بھر کی داستان دوسرے انسان کو سنائی تو واقعات کو تفصیل سے بیان کیا۔ یہی غیر شعوری طور پر تفریحی ادب کا ایک حصہ قرار پایا۔ انسان نے چاہے دنیا کی کسی زبان میں کہانی، قصہ سنایا ہو اس میں ایک قدرِ مشترک نظر آتی ہے کہ ہر کہانی کا محور انسان ہے اور عقل و دانش کی تلخی کو واقعات کے انوکھے پن میں لپیٹ کر پیش کیا۔ یہی کہانیاں اپنی انتہا پر پہنچ کر داستان بن گئیں۔

دنیا کی تاریخ داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ انسان جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے اور نہیں کر پاتا تو اسے تخیل میں حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح داستان زندگی سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ ہندوستان میں داستانوں کی ابتداء اس وقت ہوئی جب سارے ملک میں انتشار اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ بیرونی حملوں اور خانہ جنگیوں نے ملک کے امن و امان کو ختم کر دیا تھا۔ عوام ہی نہیں، بادشاہ و امراء بھی پریشان تھے۔ میدانِ عمل میں جوہر دکھانے کے بجائے خیالات کے جہاں آباد کئے جانے لگے۔ ایسے ماحول میں اردو داستانوں نے عربی، فارسی اور سنسکرت سے فائدہ اٹھایا اور مقامی رنگ و روایات کو اپنے اندر سمو کر عروج کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔ یہ داستانیں صرف تفریح طبع کا ذریعہ ہوتی تھیں۔ ان کے طرزِ بیان میں ایک طرح کا تکلف اور تصنع ہوتا تھا۔ واقعات زیادہ تر مافوق الفطرت اور غیر حقیقی ہوتے تھے۔ طرزِ بیان کے اعتبار سے یہ قصے بڑے اہم تھے۔

ہندوستانی ادب پر جب انگریزی ادب کے اثرات پڑنے شروع ہوئے تو داستان کی جگہ ناول نے حاصل کر لی۔ پرانی طرز کی داستانیں اب فرصت کے فقدان کی وجہ سے متروک ہونے لگیں۔ اردو کا افسانوی ادب ابھی تک صرف تفریح طبع کا ذریعہ تھا۔ لیکن اب واقعاتی زندگی کو بھی موضوع بنایا جانے لگا۔ ادب سے اصلاح کا کام لیا جانے لگا اور انسان کی تقدیر کو سنوارنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔

داستان گوئی کے عہد میں ہی ناول نگاری کی بھی ابتداء ہوئی۔ یہ صنفِ ادب مولوی نذیر احمد کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ سرشار، شرر، اور رسوا نے ناول کو عالمی ادب کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ تھوڑے عرصے بعد ہی اردو فکشن میں افسانے کا دور شروع ہوا۔ مختصر افسانہ بھی اردو ادب میں مغربی ادب کے توسط سے آیا تھا اور ناول کے ساتھ ساتھ مختصر افسانہ بھی برابر ترقی کرتا رہا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ انسان کم سے کم وقت میں اپنی کہانی کہنے اور سننے کے ذوق کی تسکین کرنا چاہتا تھا۔ چوں کہ صنعتی انقلاب نے فرصت کو بہت محدود کر دیا تھا اس لئے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے انسان نے افسانے کو اپنا لیا۔

اردو میں مختصر افسانے کی ابتداء انتشار کے دور میں ہوئی۔ بیسویں صدی کے شروع

میں ہندوستانی سماج میں بڑا بکھراؤ آگیا تھا۔ مختلف تحریکات اپنے عروج پر تھیں، سیاسی رہنما تعلیمی اور معاشرتی اعتبار سے کچھ اصلاحیں نافذ کروانا چاہتے تھے لیکن مذہبی پیشوا ان کے اثرات سے نالاں تھے، اور عوام کو اس سیلاب سے بچانا چاہتے تھے۔ صنعتی انقلاب نے انسان کو مشین بنا دیا تھا۔ اس کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا اور لوگ "طلسم" کی جگہ "حقیقت" کی سنگلاخ دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔

ادب زندگی کا ترجمان ہے اس لئے اپنی عصری زندگی سے الگ ہوکر نہیں رہ سکتا اس میں اپنے دور کے مسائل، تبدیلیاں اور وسعتیں اپنے آپ داخل ہو جاتی ہیں۔ افسانہ آج کی مصروف ترین زندگی میں اختصار کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے کیوں کہ وہ قاری کے ذہن کو پوری طرح متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

افسانہ ایک ایسی تصویر ہے جو برش کی ایک ہی لکیر سے بن جاتا ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اسی طرح اچھی کہانی لکھنا بھی بڑا مشکل کام ہے۔ آج کی زندگی کی نیرنگیوں اور باریکیوں پر جس کی نظر پڑ جائے، جس کے قلم میں اتنی طاقت ہو کہ وہ لوگوں کے ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے اور دیر تک اپنے اثر کو قائم رکھ سکے وہ ہی ایک اچھا افسانہ نگار ہے اچھے افسانے اور اچھے شعر میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ اگر ہے تو صرف اتنا کہ شعر "چھوٹی بحر" میں ہوتے ہیں اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں ہوتا ہے جو افسانے میں شروع سے آخیر تک چلتی رہتی ہے۔ افسانے کا فن ریاضت اور محنت مانگتا ہے۔ آخر اتنی لمبی بحر سے نبرد آزما ہونے کے لئے بہت سی صلاحیتیں اور قوتیں درکار ہیں۔ افسانہ ایک شعور، ایک احساس ہے جو ہر ایک میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

مختصر افسانہ کو فارسی میں "داستانِ کوتاہ" اور عربی میں "قصۃ القصیر" کہتے ہیں۔ انگریزی میں "Short Story" جس طرح انگریزی میں فکشن کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح اردو میں افسانہ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔
ایچ. ای. بیٹس نے اپنی کتاب "The Modern Short Story"

"دی ماڈرن شارٹ اسٹوری" میں افسانہ لکھنے کی نزاکت کے احساس پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ "کہانی لکھنا گویا دیاسلائی کے تنکوں سے عمارت بنانا ہے اور اس عمل میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب ایک اور تنکا اڑا۔ اڑا دھم کر کے سب کو گرا سکتا ہے۔"

ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی تاریخ میں وقت کا احاطہ کیا ہے :-

"قصہ کی ایسی قسم جسے آدھ گھنٹے میں پڑھا جاسکتا ہو۔"

"ایڈگر ایلن پو" نے افسانے کی تعریف اس طرح کی ہے کہ وہ مختصر افسانہ جو آدھے گھنٹے سے لے کر ایک یا دو گھنٹے کے اندر پڑھا جاسکے۔

مذکورہ دونوں تعریفیں جامع نہیں ہیں۔ افسانے کو ہم صرف وقت کے دائرے میں قید نہیں کر سکتے، یہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں ایجاز و اختصار کے ساتھ ساتھ تخیل کی چاشنی، پلاٹ کی ترتیب و تنظیم اور وحدت تاثر پیدا کرنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیئے۔

ہیملٹن اپنی کتاب میٹریل آف فکشن (Meterial of Fiction) میں افسانے کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔ "افسانے کا مقصد کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ موثر انداز میں پڑھنے والے کے ذہن میں ایک واحد تاثر پیدا کرنا ہے۔"

"ولیم دان اد کارنو" نے اپنی کتاب "فورسس آف فکشن" میں کہانی کے بارے میں لکھا ہے ــــ "جو ادیب اپنے موضوع کو تکنیکی انداز میں مکمل طور پر پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہی ایسے تشفی بخش ادب کو جنم دے سکتا ہے جس کا موضوع زیادہ متناسب، بھرپور اور معنی خیز ہو۔"

مختصر افسانہ زندگی کی کسی لمحاتی اور وقتی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے ... کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہنا اس فن کی بنیادی خصوصیت ہے۔ لیکن افسانہ نگار کے اس اظہار میں انتشار نہیں ہونا چاہئے۔ افسانہ بڑی چابکدستی، باریک بینی اور اختصار چاہتا ہے۔ اختصار میں جامعیت ہو اور زندگی کے کسی ایک گوشہ کی عکاسی، ترجمانی یا جھلک پیش کی جائے۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ مختصر افسانے میں کسی ایک واقعہ، کسی ایک خیال، ایک احساس، ایک تجربہ کو کم سے کم اور خوبصورت سے خوبصورت لفظوں میں اس طرح ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے کہ شروع سے آخیر تک ایک واحد تاثر قائم رہے ساتھ ہی ابتداء، ارتقاء اور انجام کا احساس بھی ہو۔ یہی مختصر افسانے کی جامع تعریف ہے۔

ہر عہد میں نئے تصورات اور نئی تکنیک جنم لیتی رہتی ہے۔ اگر معاشرت میں تبدیلیاں ہوتی ہیں تو ادب میں بھی تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں۔ سوچنے سمجھنے کے انداز بدلنے لگتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی جب مغربی اثرات بڑھنے لگے اور مغربی تہذیب و تمدن اور وہاں کے ادب کو اپنانا ہندوستانیوں کی ضرورت بن گیا تو دیگر اصنافِ ادب کی طرح مغربی افسانہ نگاروں کے اثرات بھی اردو کے افسانہ نگاروں نے کافی حد تک قبول کئے۔ جرمنی، امریکہ روس اور فرانس میں مختصر افسانہ کا آغاز تقریباً ایک ساتھ ہوا۔ ان مغربی ممالک کے ادیبوں نے اس نئی صنف کو اس لئے اختیار کیا کہ انھوں نے اس نوزائیدہ صنف کے روشن مستقبل کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے ہندوستان کے ادیبوں نے بھی تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ اس جدید رجحان کو قبول کر لیا۔

انگلستان میں اس صنفِ ادب کا آغاز کافی تاخیر سے ہوا۔ اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ شاید لوگوں نے ناول کے مقابلے میں اسے سنجیدہ صنف ادب مانا ہی نہ ہو۔۔ لیکن اٹھارہویں صدی میں یہ ایک اہم رجحان بن گیا۔ رومانی تحریک نے بھی اس صنف کے فروغ میں کافی حصہ لیا۔ Gift Books کے ذریعے اشاعت کے دروازے اس صنف کے لئے کھل گئے۔ ایسے ہی جرائد اور میگزین کے مدیروں کے درمیان مقابلے کی ایک ایسی فضا تیار ہو گئی جس نے مختصر افسانے کے بازار کو بھی بہت وسیع کر دیا۔ اس طرح یوروپی ممالک نے مختصر افسانے کی نشوونما میں بڑا حصہ لیا۔

مختصر افسانے کی تاریخ میں ایڈگر ایلن پو کی بڑی اہمیت ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ مختصر افسانہ نہ صرف ایک مکمل صنف ادب ہے بلکہ ایک شاندار آرٹ بھی ہے۔ اور اس کا مستقبل بہت درخشاں ہے۔ یہی افسانہ کا پہلا ناقد بھی ہے۔ اس نے افسانے کی پہچان

کرائی۔ اس کے اصول و ضوابط مقرر کئے۔ ہاؤتھورن اور ہرمن کے مختصر افسانہ کے عناصر میں اخلاقیات کے جزو کو بھی شامل کر دیا اور "پو" نے افسانوں کی تاریخ میں اضافہ کیا۔ ان کے یہاں ایک طرح کی اشاریت و رمزیت پائی جاتی ہے۔

جب امریکہ میں یہ تین اہم افسانہ نگار نئے تجربے کر رہے تھے اس وقت یورپ کے دوسرے ممالک جن میں فرانس اور روس قابلِ ذکر ہیں، ادب کی اس نئی صنف کے ذریعہ زندگی کی چھوٹی بڑی صداقتوں کو موضوعِ ادب بنا رہے تھے۔ اخلاقی روایات کے خلاف حقیقت نگاری کی روایت کی داغ بیل پڑ رہی تھی اور کہانی کو صاف ستھرا اور معروضی بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ "ترگنیف" نے جو کہ ایک روسی افسانہ نگار تھا روسی افسانے کو ایک نئے سمت دی۔ ایک نئی شاہراہ بنائی۔ اس نے کرداروں کے ذریعہ زندگی کی بڑی واضح تصویر کو پیش کیا۔ اس نے واقعات کو نہیں بلکہ کرداروں کو زیادہ اہم بنا کر پیش کیا۔

موپاساں اور چیخوف نے فرانس اور روس میں "پو" اور ترگنیف کی روایات کو مضبوط و مستحکم بنا کر آگے بڑھایا۔ موپاساں نے اپنے افسانوں میں پلاٹ سازی، جزئیات نگاری اور کلائمکس کے ساتھ ہی کرداروں کی کشمکش اور تصادم کو بھی افسانہ میں جگہ دی۔ ......

چیخوف نے افسانے کو جذبات سے پُر بنا دیا۔ ہم اس کے کرداروں کو چھو کر دیکھ سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں۔ اس کی کہانیاں پڑھنا لطف کے ساتھ ساتھ مسرت بھی بخشتا ہے۔ اس نے معمولی کرداروں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی اور اپنے افسانوں کو نقطۂ عروج یا کلائمکس سے نجات دلائی۔

ایڈگر ایلین پو، موپاساں، چیخوف اور "فرانز کافکا" حقیقت میں یہ سب اعلیٰ درجہ کے ادیب و فنکار ہیں۔ ان کے اثرات ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس طرح بیسویں صدی کی دو دہائی پوری ہوتے تک مغربی ادب میں مختصر افسانہ کی ایک مستحکم روایت قائم ہو چکی تھی۔

اردو کے مختصر افسانوں پر ان مغربی افسانہ نگاروں کا براہِ راست اور بالواسطہ اثر پڑا۔ لیکن اردو کے افسانہ نگاروں نے مقامی رنگ و آہنگ، لب و لہجہ اپنا کر افسانے کو اس

طرح اپنے رنگ میں پیش کیا کہ یہ تمام دھارے اردو افسانے کے دھارے بن گئے۔

پریم چند ہوں یا کرشن، بیدی، منٹو یا عصمت یہ سب مغرب کے افسانوی ادب سے متاثر ہیں اور موپاساں، چیخوف، جیمس جوائس اور ہنری یا فرائیڈ کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ مختصر افسانہ غیر ملکی زبان سے اردو ادب میں آیا۔ لیکن اس کی جڑیں اردو ادب میں اتنی گہرائی تک پیوست ہو گئی ہیں کہ یہ نہیں محسوس ہوتا کہ یہ مغربی ادب کی تقلید میں لکھے گئے ہیں۔

پریم چند، کرشن چندر، احمد علی، عزیز احمد، منٹو، عصمت، بیدی، ممتاز مفتی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر وغیرہ اردو افسانہ کے یہ سبھی بڑے فنکار کسی نہ کسی مغربی ادیب سے متاثر ہوئے۔ اور ان کے افسانوں میں ہمیں وہی انداز نظر آتا ہے مغربی ممالک میں افسانہ سوسائٹی کے لئے آئینہ کا کام کرتا ہے۔ ہمارے افسانہ نویسوں نے بھی افسانہ سے کچھ اسی قسم کا کام لیا ہے۔

اردو ادب نے عہد جدید میں افسانہ نگاری اور شاعری کے میدان میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ عالمی ادب میں اردو کو ان دونوں اصناف کی وجہ سے ہی اعلیٰ مقام حاصل ہو سکا ہے۔

یہ بات ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ پریم چند کے ساتھ ساتھ جن لوگوں نے اس صنف کو آگے بڑھانے میں مدد کی ہے ان میں سلطان حیدر جوشؔ، سجاد حیدر یلدرم، نیازؔ فتحپوری کے نام سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ پریم چند کے ابتدائی افسانوں کا مقصد قوم میں وطن کی محبت کو بیدار کرنا، وطن کے عشق میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ سلطان حیدر جوشؔ خالص معاشرتی اور اصلاحی افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے بین تضاد کو دو قوموں اور دو تہذیبوں کے فطری فرق کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کا محرک رومانیت کا تصور اور ایک متوازن قسم کا احساسِ فن ہے۔ نیازؔ فتحپوری کے افسانوں

میں حسن و عشق کی داستانیں، محبت اور عورت کا ذکر ملتا ہے۔ غرض کہ ان افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے مزاج کی مناسبت سے کہانی سے مختلف کام لئے۔

اردو افسانہ جب ایک صنف کی حیثیت سے اردو ادب میں داخل ہوا تو وہ زندگی کے بہت قریب بھی تھا اور بہت دور بھی۔ وہ تلخ و شیریں حقائق کا ترجمان بنا۔ معاشرت و سیاست، محبت و نفرت، مشاہدہ تخیل اور تاریخ، رندی و سرمستی حسن فطرت غرض ہر طرح کے خیالات سے مزین مختصر افسانہ کا آغاز ہوا۔ یا اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ کا آغاز حقیقت اور شعریت سے معمور زندگی اور فن کے امتزاج کا ابتدائی نقش ہے۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۰۸ء سے مانا جاتا ہے۔ ۱۹۲۹-۳۰ء تک پہنچتے پہنچتے اس تصویر میں نہ جانے کتنے رنگ بھرے گئے۔ پریم چند، نیاز، یلدرم مجنوں کے ساتھ ساتھ علی عباس حسینی، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر، ل. احمد اکبر آبادی کے بھی افسانے اس دور میں نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کی تقلید میں بہت سے لکھنے والے سامنے آئے اور اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو گئے۔ اس گروہ میں سب سے آخیر تک لکھنے والوں میں پریم چند اور نیاز فتحپوری ہیں۔

پریم چند نے افسانوں میں دیہاتی زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ دیہات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ بڑے عمیق مشاہدے سے کر کے فطرتِ انسانی کی بڑی اچھی ترجمانی کی ہے۔ ان کے افسانے کردار نگاری کے اعتبار سے بھی افسانے کی تکنیک پر پورے اترتے ہیں۔ زبان و بیان کی سادگی بھی ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ جزئیات نگاری کی وجہ سے بھی افسانوں میں اثر انگیزی پیدا ہو گئی ہے۔ فنکار کی تمنائیں اس کے اصول اور آدرش اس کی فنی تخلیقات میں کس طرح جلوہ گر ہو سکتے ہیں اور اس کی حقیقی زندگی کس طرح ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ یہ بات پریم چند نے ہی اردو افسانہ نگاروں کو سکھائی۔ انھوں نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۳۶ء تک مسلسل افسانے لکھے ہیں جو تقریباً تعداد میں تین سو کے قریب ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے بعد تقریباً پانچ سال کے افسانوی ادب پر نظر ڈالی جائے تو بے شمار لکھنے والے

نظر آتے ہیں لیکن ان میں ایک بڑی تعداد تو ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کی تقلید کی ہے۔

ان پانچ سالوں میں افسانے ایک طرف تو بین الاقوامی سیاسی اور معاشی حالات سے متاثر ہوئے اور دوسری طرف ملکی اور قومی زندگی کے انتشار کے ترجمان بن کر سامنے آئے۔ پریم چند نے زندگی کی کشمکش کو اردو افسانے کا موضوع بنا کر پیش کیا۔

سنہ ۱۹۳۵ء تک افسانہ کی دنیا میں بہت سے نئے ناموں کا اضافہ ہوا۔ جو سنہ ۱۹۲۰ء سے پہلے لکھ رہے تھے انھوں نے بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ ان لکھنے والوں میں پریم چند، علی عباس حسینی، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، حامد اللہ افسر، سدرشن، ل۔ احمد اکبرآبادی، اعظم کریوی، راشد الخیری اور عظیم بیگ چغتائی کے نام نمایاں ہیں۔ کچھ افسانہ نگار سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۵ء کے درمیان افسانہ لکھتے نظر آتے ہیں۔ ایسے لکھنے والوں میں سے محمد مجیب، خواجہ منظور احمد، سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسی دور میں پریم چند نے اپنا عظیم افسانہ "کفن" لکھا جو افسانہ کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی روشنی میں افسانہ کو نئی نئی شاہ راہیں ملیں۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں دس افسانوں کا مجموعہ "انگارے" شائع ہوا اور سنہ ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ "انگارے" میں دس کہانیاں ہیں۔ پانچ سجاد ظہیر کی دو رشید جہاں کی دو احمد علی کی اور ایک محمود الظفر کی۔

جدید افسانہ نگاری کے جو نمونے انگارے کے مصنفین کے ذریعے سامنے آئے وہ پریم چند کے متوازن اسلوب کا ایک ردِ عمل تھے۔ انگارے کے مصنفین نے جو افسانے لکھے ہیں وہ اخلاقی قوانین کے خلاف ایک "وحشیانہ بغاوت" ہے۔ ان پر مغربی افسانہ نگاروں ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور جیمس جوائس کے اثر کے ساتھ ساتھ اردو کے رومانی ادیبوں کی ان تحریروں کا جن میں فرسودہ اخلاقی نظام کے خلاف ایک انقلابی رومانیت اور شوخ و بے باکانہ انداز کا اثر ملتا ہے۔

"انگارے" کے مصنفین نے ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے راسخ عقیدوں کے خلاف ایسی باتیں کہیں جن کو کہنے سننے میں لوگ جھجک محسوس کرتے تھے۔ لوگوں نے اب تک زندگی کے جن پہلوؤں کو دیکھ کر دیدہ و دانستہ چشم پوشی کی تھی انگارے کے مصنفین نے بے باکی سے ان کا اظہار کر دیا۔ ان افسانوں نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے پڑھنے والوں کو چونکا دیا اور ایسی بغاوت کی بنیاد ڈالی جس کے بغیر کسی جہانِ نو کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔

"انگارے" کی کہانیوں نے افسانہ کے سیدھے سادے فن کو بیسویں صدی کے پیچیدہ مسائل سے براہِ راست جوڑ دیا۔ مغرب کے اثر سے افسانے میں ٹیکنیک اور زبان و بیان کے اعتبار سے لاتعداد تجربے ہوئے۔ کچھ افسانہ نگار فرائڈ سے بھی متاثر ہوئے۔ حیات اللہ انصاری سہیل عظیم آبادی اور پریم چند جیسے فنکار بھی اپنے فن کی روش بدلنے پر مجبور ہوئے۔ اس طرح افسانہ اس روایت سے بہت دور ہو گیا جس کی بنیاد پریم چند نے رکھی تھی۔ جدید افسانہ میں یہ میلانات بہت واضح نظر آئے اور ایک ساتھ چلتے رہے۔ مجموعی طور سے اس دور کو افسانہ کا عہد زریں کہہ سکتے ہیں کیوں کہ موضوع اور فن دونوں اعتبار سے اردو زبان کے سرمائے میں اعلیٰ درجے کے افسانوں کا اضافہ ہوا۔

سنہ ۱۹۳۶ء سے اردو ادب ایک نئی تحریک سے روشناس ہوا جسے ترقی پسند تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے قیام میں ملکی حالات کے علاوہ دو چیزوں نے اہم رول ادا کیا۔ ایک تو پریم چند کا افسانہ "کفن" اور دوسرا مجموعہ "انگارے"

ترقی پسند تحریک کی ابتدا سنہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں ہوئی۔ نوجوانوں کا ایک گروپ جس میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر تھے۔ انھوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام ہندوستانی ترقی پسندوں کی انجمن طے ہوا۔ اور ملک راج آنند اس کے صدر مقرر ہوئے۔ انھوں نے ایک مینی فیسٹو تیار کیا۔ جس پر ان پانچوں کے دستخط تھے۔ اس مینی فیسٹو کو سب سے پہلے پریم چند نے قبول کیا اور اپنے رسالے "ہنس" میں شائع کیا۔ . . اور اس کی حمایت میں کہا کہ یہ ہمارے ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ اس تحریک کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادب کے

فرسودہ ڈھانچے کو توڑ دیا اور اس محدود تصور کو ختم کر دیا کہ ادب کا مقصد محض تفریحِ طبع ہے۔ جو صرف امیروں کی لطف اندوزی کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں سے اس بات کو منوا لیا کہ ادب صرف عوامی زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کے ہر پہلو کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ ان لوگوں نے زبان کو بھی آسان و عام فہم بنایا تاکہ عوام بھی ان کے افسانوں کو پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں۔ ترقی پسندوں نے اپنا ایک رسالہ "نیا ادب" لکھنؤ سے جاری کیا جس میں احتشام حسین، مخدوم محی الدین، عصمت چغتائی، رشید جہاں، علی عباس حسینی، پریم چند، نیاز فتحپوری، احمد علی، خواجہ احمد عباس، منٹو، اور کرشن چندر کے افسانے شائع ہوتے تھے۔

ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے والوں میں حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی اور اختر اورینوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار چھوٹے بڑے معروف غیر معروف افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات سے پڑھنے والوں کو متاثر کیا۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک افسانہ کے موضوعات میں بہت وسعت پیدا ہوئی لیکن اس وسعت کے باوجود مختلف افسانہ نگاروں نے اپنے ماحول اور کرداروں کے ایسے پہلوؤں کی عکاسی کی جس کے بارے میں وہ ذاتی مشاہدہ رکھتے تھے۔ مثلاً حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی اور اختر اورینوی نے اپنے افسانوں میں دیہات کے مسائل پیش کئے۔ ان میں بھی تنوع ہے۔

احمد علی، کرشن، بیدی، منٹو، عصمت حیات اللہ وغیرہ نے مختلف شہروں کے انفرادی رنگ کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ وہاں کے مسائل اور حالات کی آئینہ داری اور اس کے ساتھ ہی نفسیاتی اور خارجی پہلوؤں کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ترقی پسندوں نے ادب کے ذریعہ عوام اور سماج کی خدمت کی۔ طبقاتی فرق کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ان کی ساری ہمدردی غریب طبقے کے ساتھ رہی اس کے ساتھ ہی انھوں نے غلامی کے خلاف عوام کو بیدار کرنے میں بھی بڑا اہم رول ادا کیا۔

ترقی پسند تحریک نے اپنے طور پر افسانے کو ترقی دی لیکن پریم چند کے افسانے بھی سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر انھوں نے افسانے کو "کفن" کے معیار تک نہیں پہنچایا ہوتا تو ترقی پسند افسانے کے اس کامیاب دور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی کی تخلیقات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ترقی پسند افسانے کے زیرِ اثر حقیقت نگاری اور نفسیات کے دھارے آپس میں مل گئے۔ رومانی اور نفسیاتی افسانے بھی لکھے گئے۔ طبقاتی کشمکش، مل مالک مزدور زمیندار اور محنت کش طبقہ کے کردار ابھر کر سامنے آئے۔ عصری مسائل، قحط بنگال، دوسری جنگ تقسیم ہند، فسادات، اقتصادی مسائل، طوائف و دلال اور گاہک، بے روزگار نوجوان ملازمت، پیشہ عورتیں اور دیگر مسائل پر بے شمار افسانے لکھے گئے۔ افراد خاندان کے مسائل پر اور ان کے جنسی مسائل پر بھی تفصیل سے کہا گیا۔ اور ہندوستان کے عقائد کی ترجمانی کی گئی ہے۔

ان تمام باتوں کا اثر افسانے کی زبان و بیان پر بھی پڑا۔ عصری مسائل کو افسانے میں پیش کرنے کی وجہ سے افسانہ نگار نے ادبی زبان کی پابندی قائم نہیں رکھی بلکہ جس طبقہ کی ان کے افسانوں میں عکاسی ہوتی تھی اسی زبان کو وہ اپنے افسانے میں استعمال کرتے تھے کردار کی مناسبت سے تشبیہہ، استعارے اور ایسے الفاظ و اشارے جن کو ادبی لحاظ سے زبان پر لانا بھی گناہ تھا، بے دھڑک افسانے میں داخل ہو گئے۔

اس تحریک کے اثر نے اردو افسانے کو عالمی معیار کے ہم پلّہ بنا دیا۔ انفرادی طور پر چند فنکار ایسے بھی ہیں جن کو اردو افسانے کا ستون کہا جا سکتا ہے۔ ان میں پہلا نام کرشن چندر کا ہے جنھوں نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں غریب طبقہ سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے پر خلوص جذبات کے ساتھ اپنے فن کی بنیاد انسانیت پر رکھی اور غیر معمولی انداز سے اپنے فن میں ان داتا، بھگت رام، کالو بھنگی، دو فرلانگ لمبی سڑک، پورہم پترا جیسے بہترین افسانے تخلیق کئے۔ دوسرے نامور افسانہ نگار منٹو ہیں جنھوں نے

نوجوان لڑکے لڑکیوں کے جنسی جذبات کی الجھنیں، طوائف کی زندگی، فلم کمپنیوں کا ماحول سے اور ہندوستان کی جنگ آزادی اور ملکی معاشی اقتصادی حالات پر اپنے افسانوں کی بنیاد رکھی۔ ان کے افسانوں میں تنوع ہے۔ ان کے مشہور افسانوں میں ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہتک، موزیل، بو، کھول دو، بابو گوپی ناتھ، ٹھنڈا گوشت اور نیا قانون ہیں۔ ان پر کئی مقدمات چلے کہ انھوں نے معاشرے کے ان پہلوؤں کو بھی ادب میں پیش کر دیا جن کی پردہ داری ضروری ہے۔

عصمت چغتائی کو خواتین افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ان کو اپنی قدرت بیان کی وجہ سے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ متوسط طبقہ کے مسلمان گھرانوں اور ان کی عورتوں، بچوں لڑکیوں کی جنسیاتی اور نفسیاتی الجھنوں کو اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے "چوتھی کا جوڑا" جیسا بہترین افسانہ لکھا۔ اس موضوع و مسئلہ پر انھوں نے جس انداز سے روشنی ڈالی ہے اس سے ان کی فنی مہارت اور زبان پر غیر معمولی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں حقیقت نگاری گہرا مشاہدہ، صاف گوئی اور بے باکی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ ان کے افسانے کلیاں، چوٹیں، دھانی بانکیں، دو ہاتھ امربیل وغیرہ ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کو جدید افسانوی ادب میں کرداری افسانوں کا نمائندہ کہا جاتا ہے۔ انھوں نے زندگی اور امید کا ہمیشہ پیغام دیا۔ روزمرہ کی زندگی میں ایسے کرداروں کی تخلیق کی جن سے ہماری آپ کی روز ملاقات ہوتی ہے۔ گرم کوٹ، من کی من میں، دس منٹ بارش میں، غلامی، تلادان، بیکار خدا، کشمکش وغیرہ ان کے مشہور اور جاوداں افسانے ہیں۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور میں جتنے اچھے افسانے لکھے گئے ان کو عالمی ادب کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ افسانہ نگاروں نے لکھنا بند کر دیا آزادی کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوئے۔ لیکن آزادی کے ساتھ قتل و خون اور غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ بستیاں آبادیاں اجڑ گئیں۔ معزز خاندان برباد ہو گئے۔ بھوک افلاس کا دور

دورہ ہوا۔ ان موضوعات کو افسانہ نگاروں نے بڑی خوبی کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ کرشن کی پیشاور ایکسپریس' منٹو کے افسانے نمرود کی خدائی' عصمت کا "دھانی بانکپن" وغیرہ کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ کیوں کہ اس دور میں مذہبی تعصب نے انسانوں کو اندھا کر دیا تھا۔ اس لئے زیادہ تر افسانے اسی موضوع پر لکھے گئے۔

نفسیاتی افسانے کی طرف بھی اس دور میں رجحان بڑھا۔ یعنی خارجی واقعات کے ساتھ داخلی واقعات کو بھی افسانے میں جگہ دی گئی۔ سماج میں بے چینی بڑھنے سے عقائد میں تبدیلی ہوئی۔ صنعتی و معاشی انقلاب نے بھی افسانہ پر بڑا اثر ڈالا۔ اب انسان کی نجی زندگی کو افسانہ میں جگہ دی جانے لگی کیوں کہ اردو افسانہ پر مغربی ادب کا ہمیشہ گہرا نقش رہا ہے۔ اب بھی گورکی' ژولان بارتھ' ایچ۔جی۔ ویلز جیسے افسانہ نگار اردو ادیبوں کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف جیمس جوائس' لارنس اور ورجینا ولف وغیرہ کا اثر بھی ہے۔ اسی لئے نفسیاتی اور فراری ذہنیت کی بھی عکاسی اردو افسانہ میں کی جانے لگی۔ اس دور میں ہاجرہ مسرور اور قرۃ العین حیدر کا انداز داخلی تھا۔

اردو افسانہ میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک کے دوران میں نفسیاتی عناصر تیزی سے داخل ہوئے۔ افراد کی ذاتی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کا بھی تجزیہ افسانوں میں کیا جانے لگا۔ تنہائی کا احساس مریضانہ ذہنیت اور خودکشی کو بھی افسانہ میں شامل کیا جانے لگا۔ قرۃ العین حیدر' جیلانی بانو' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور وغیرہ نے خواتین کی نفسیاتی الجھنوں' ناکامی اور محرومی کو جو دورِ جدید کا المیہ ہے اپنے ذاتی تجربے' مشاہدے اور مطالعہ کے ذریعہ افسانوں میں پیش کیا۔ قرۃ العین حیدر' جوگیندر پال اور غیاث احمد گدی نے جدید افسانے میں ذہنی فضا پر بہت زور دیا۔ بیانیہ انداز کو اپنایا۔ خطوط اور رپورتاژ نگاری سے بھی کام لیا جانے لگا۔

زندگی کے نئے میلانات اور حیات و کائنات کے متعلق عصری آگہی نے ہمارے افسانہ کی بساط کو پھیلا دیا۔ لیکن قاری کی دلچسپی کے سامان کا اس میں فقدان ہو گیا۔ ادیب قاری سے زیادہ اپنی ذہنی آسودگی کا خیال کرنے لگا۔ نئے لکھنے والوں نے افسانہ کی تکنیک کا

خیال رکھ کر اس انداز سے لکھا کہ فطری بہاؤ کی کمی افسانہ میں محسوس ہونے لگی۔ اردو کے بیشتر علامتی افسانے قاری تک اپنی بات پہنچانے میں ناکام رہے۔

اردو میں علامتی افسانے معدودے چند لکھے گئے ہیں۔ جن افسانہ نگاروں نے علامتی افسانہ کی طرف خاص دھیان دیا ہے ان میں انتظار حسین، انور سجاد، سریندر پرکاش، بلراج مین را، قمر احسن، انور خاں، سلام بن رزاق، خالدہ حسین، رشید امجد، غیاث احمد گدی، احمد ہمیش، عبدالصمد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

جدید علامتی افسانہ قاری کے احساس اور شعور سے بڑی حد تک عاری ہے۔ روایت کا بھی اس میں پاس نہیں۔ وہ آج پریم چند اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کا افسانہ نہیں جنھوں نے گاؤں اور محنت کش طبقہ کی عکاسی کی ہے بلکہ آج افسانہ شہروں میں سمٹ کر رہ گیا اور اس کے ساتھ ہی جدید افسانہ نے ترقی پسند افسانہ سے بھی اپنا ناتا توڑ لیا ہے۔ پھر بھی اردو افسانہ کے لئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہزار پُرخطر راہوں سے گزرے لیکن پھر بھی اپنا سفر جاری رکھے گا۔

اردو افسانہ کے ارتقاء کو ترقی کی راہوں پر گامزن کرنے اور اسے جِلا بخشنے میں راجستھان کے فنکار بھی پیچھے نہیں رہے۔ اگرچہ راجستھان میں افسانوی ادب کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ انیسویں صدی عیسوی سے ہی شروع ہو چکا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ فنی اعتبار سے اس خطے میں اردو افسانہ کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔

مولوی مجاہد الدین نسیم عثمانی کا افسانہ "جمیل" ۱۹۰۶ء میں سب سے پہلے منظرِ عام پر آیا۔ یہ ایک عشقیہ افسانہ ہے۔ اس میں فن اور اندازِ بیان کی خامیاں نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۲ء میں کچھ طویل افسانے لکھے گئے۔ ٹونک، جھالاواڑ اور بوندی وغیرہ کے کچھ افسانہ نگار اس دور میں طویل افسانے لکھتے نظر آتے ہیں لیکن ان پر فنی اعتبار سے نامکمل ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں راجستھان میں کچھ بہتر افسانہ نگار فنی اعتبار سے

افسانہ کے معیار کو بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ جے پور سے ایک رسالہ "شادماں" نکلتا تھا جس میں کنور یاسین علی خاں اور صاحبزادہ ولی احمد قدسی کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد طاسین ذہین کے چند افسانے ماہنامہ "بزم راجستھان" میں نظر آتے ہیں۔

موجودہ صنعتی دور میں جب انسان کے پاس فرصت مفقود ہے اپنے اختصار کے باعث افسانہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس لئے اس فن کی طرف زیادہ تر ادیب متوجہ ہونے لگے۔ ۱۹۳۱ء میں عظیم بیگ چغتائی اور اس کے کچھ عرصہ بعد ان کی بہن عصمت چغتائی اس فن کو آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ جودھپور ان کا وطنِ ثانی تھا لیکن راجستھان سے ان کے تعلق کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اسی دور میں اختر شیرانی مرحوم نے بھی چند افسانے اور ڈرامے لکھے اور کچھ دوسری زبانوں سے ترجمے کئے۔ یہ زمانہ ٹونک کے ادبی شباب کا زمانہ تھا۔ اسی دور میں محمد عمر خاں جاؔم، صاحبزادہ متین اللہ واثقؔ، مولانا حبیب اللہ فضاؔئی اور صاحبزادہ شفیق الرحمٰن کے نام بھی ٹونک کے افسانہ نگاروں میں نظر آتے ہیں۔

تقسیم کے بعد راجستھان کے کچھ افسانہ نگار پاکستان چلے گئے۔ مثال کے طور پر مشتاق احمد یوسفی جو اس وقت بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ وہ ٹونک کے رہنے والے تھے کچھ عرصہ جے پور میں بھی رہے۔ ان کی تخلیقات میں ٹونک کا ذکر بھی جا بجا ملتا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں جے پور میں انجمن ترقی اردو ہند کی بنیاد رکھی گئی جس نے اردو عوام میں اردو کی محبت کو بیدار کیا۔

ماہنامہ "نخلستان جے پور" میں کوٹہ، جودھپور، اودے پور، ٹونک، اجمیر، بانسواڑہ، بوندی، اور ملکرانہ وغیرہ کے مختلف افسانہ نگاروں کی تخلیقات شائع ہوئیں اس کے علاوہ راجستھان کے افسانہ نگاروں کی نگارشات ملک کے مشہور رسائل میں منظر عام پر آتی رہیں۔

سدرشن بالی، حامد رشید ٹونکی مرحوم، ستّار جے پوری مرحوم، کلیم الدین تجلی عثمانی مختار الرحمٰن راہی، ظہور الحسن شارب، سید فضل المتین، ممتاز شکیب، پروفیسر پریم شنکر شریواستو، حبیب کیفی، خلیل تنویر، حسن جمال، جاوید مشکور، صالح محمد نائب، ڈاکٹر عالم شاہ

خاں، شکیلہ آفریدی، مہدی ٹونکی، شناشا بالی، ڈاکٹر رتن چند، زیبا خان، جاوید کمال، راشد شمشاد، سعید الظفر، بہار ٹونکی، مختار ٹونکی، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، وحید منصب قیصر رشید بھارتی وغیرہ کی تخلیقات کافی عرصہ سے منظر عام پر آتی رہی ہیں۔

روشن اختر کاظمی کے افسانوں کا مجموعہ "ایک قدم اور" ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کا مجموعہ "سنگِ زر" قیصر رشید بھارتی کا مجموعہ "در دانے" اور "کہکشاں بھارتی" ممتاز شکیب نے اردو اکادمی کے مالی تعاون سے "مٹی کی خوشبو" اور "پہلی آواز" افسانوں کے مجموعے ترتیب دئے۔ مہدی ٹونکی کے افسانوں کے مجموعے "لہو کا اجالا" "زوال شروع ہوتا ہے" اور "ایک اور نروان پاتوا" شہناز فاطمہ کا افسانوی مجموعہ "خواہشیں" شائع ہو چکے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو جے پور سے اردو پروگرام "کہکشاں" میں مختار ٹونکی، عارفہ سلطان ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، مہدی ٹونکی، ڈاکٹر عمر جہاں، قیصر رشید بھارتی، سید معقول احمد ندیم، شہناز فاطمہ رشید، اور نجمہ برکاتی کے افسانے نشر ہوتے رہے ہیں۔ ان ادیبوں کے افسانے ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

جے پور سے ڈاکٹر محمد علی زیدی، شناشا بالی، مختار الرحمٰن راہی، روشن اختر کاظمی، رئیس احمد عثمانی، اودے پور سے حبیب کیفی، آر۔ زیڈ۔ عثمانی، مشکور جاوید، اجمیر سے سید فضل المتین وغیرہ کے افسانے نشر ہوتے رہے ہیں۔

علاوہ ازیں عقیل شاداب، عبدالمجید خاں، شاہد عزیز، رئیس احمد عثمانی، نذیر فتحپوری کے افسانے بھی رسالوں میں چھپتے ہیں۔

راجستھان میں خواتین افسانہ نگار بھی اب ابھر کر سامنے آنے لگی ہیں۔ ان میں عارفہ سلطان، ڈاکٹر عمر جہاں صدیقی، ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، شہناز فاطمہ رشید، شہزادی بانو زیبا خاں، شکیلہ آفریدی کے نام شامل ہیں۔ مجیبہ حفیظ، نجمہ برکاتی، فرزانہ خاں اور پروین خاں نے بھی چند اچھے افسانے لکھے ہیں۔

اس "انتخاب" میں شامل قلم کاروں نے موجودہ دور کے مسائل کو مدنظر رکھ کر

اپنے افسانے تخلیق کئے ہیں جو ان کے خیالات کی گہرائی اور گیرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔

راجستھان اور ملک کے مختلف رسائل و اخبارات میں جن افسانہ نگاروں کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں ان میں سے تقریباً پچاس ناموں کا انتخاب کرکے ان کو خط لکھے گئے ..... کچھ حضرات نے فوراً جواب سے نوازا۔ چند حضرات نے دوسرے خط میں جواب دے دیا۔ کچھ حضرات نے لکھا کہ وہ اب اس میدان میں نئی تخلیقات کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں۔ کچھ حضرات نے تین بار اصرار کرنے پر بھی جواب دینے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ غرض اسی تگ و دو میں تقریباً ۲۵ افسانے حاصل ہو سکے جن میں تقریباً بارہ نام ٹونک کے ہیں اور تیرہ نام جے پور، کوٹہ، ادے پور، جودھ پور وغیرہ کے ہیں۔

یہ مجموعہ ترتیب دینے کے لئے دو دو غیر مطبوعہ تخلیقات مانگی گئی تھیں جن میں سے ایک کا انتخاب کیا گیا ہے۔ چند افسانہ نگاروں کے علاوہ تمام افسانہ نگاروں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ غیر مطبوعہ تخلیقات ہی شامل ہوں۔ اس شرط کی وجہ یہ رہی کہ اس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ "فنکار کا قلم ابھی حرکت میں ہے۔"

اس "انتخاب افسانہ" میں جہاں آپ کو راجستھان کے نامور افسانہ نگار نظر آئیں گے وہاں چند ایسے افسانہ نگاروں کے نام بھی دکھائی دیں گے جو تازہ واردانِ بساط ہوائے دل ہیں۔ لیکن ان کے افسانوں میں فن کی نزاکت اور وقت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان افسانوں میں کہیں آپ کو فسادات کے روح فرسا مناظر نظر آئیں گے، کہیں جہیز کی لعنت پر گہرا غم و غصہ ملے گا کہیں روزی روٹی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کا پتہ چلے گا تو کہیں محبت کی محرومیاں سے ملیں گی۔ افسانوں کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ افسانے انفرادیت لئے ہونے کے ساتھ اپنے وقت کی آواز بھی ہوں۔ خلیل تنویر صاحب اور نذیر فتحپوری کے "منی افسانے" اس انتخاب میں اس لئے شامل کئے ہیں کہ آج کا دور "مختصر ترین" کہانی کا دور بھی ہے۔ اور منی کہانیاں بھی اس لئے لکھی جا رہی ہیں کہ فرصت کے اوقات قاری کے پاس کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ افسانہ کی دنیا میں یہ کہانیاں ایک تجربہ اور اضافہ ہیں۔

جہاں تک ترتیب کا تعلق ہے، میرے پیشِ نظر کئی طریقے تھے۔ لیکن مقدم و موخر کا کام

بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ اس کام میں اکثر ایسے مرحلے آجاتے ہیں جہاں یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کو کس پر فوقیت دی جائے۔ کوئی زیادہ سینیر ہے تو کوئی زیادہ مشہور۔ کوئی مبتدی ہوتے ہوئے بھی قلم کا بڑا دھنی۔ غرض دل شکنی اور جانبداری کے ارتکاب سے بچکر گذر جانے کا ایک ہی طریقہ نظر آیا کہ قلم کاروں کے ناموں کو (جس طرح ان کے ذریعہ لکھے گئے ہیں) اردو کے حروف تہجی کی ترتیب میں رکھ دیا جائے۔ اور یہ طریقہ مناسب بھی ہے۔

میں ذاتی طور پر راجستھان اردو اکادمی کے سیکریٹری جناب عبدالحیٔ صاحب۔ اور اراکین اکادمی کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے اس مجموعہ کی اہمیت و افادیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس طرف توجہ فرمائی۔ ان کے علاوہ جناب مختار ٹونکی اور جناب ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی بھی تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انھوں انے اس انتخاب کی ترتیب و تدوین میں اپنا بھرپور تعاون دیا اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔ جناب مُرلی دھر اروڑا نے اس کتاب کی کتابت میں نہایت دلچسپی دکھائی اور بہت کم وقت میں اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، وہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں جناب صابر حسن رئیسؔ صاحب کے عملی تعاون اور مفید مشوروں سے مجھے جو مدد ملی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

ناانصافی ہو گی اگر میں اپنے شوہر ڈاکٹر اعظم شاہ خاں کے اس گراں قدر تعاون کا اعتراف نہ کروں جس کے سبب مجھے اس ذمہ داری کے قبول کرنے سے لے کر کتاب کی تکمیل تک برابر تحریک و توصلہ ملتا رہا۔

راجستھان اردو اکادمی کے چیئرمین جناب انعام الحق صاحب کی تو خصوصی طور پر سپاس گذار ہوں۔ اول اس لئے کہ انھوں نے قلم کار جیسے ہمہ اوصاف لوگوں کی گراں قدر تخلیقات کے انتخاب کی ایک اہم ذمہ داری مجھے سونپی۔ دوئم اس لئے کہ کتابت و طباعت سے لے کر اس کتاب کے آپ کے ہاتھوں تک پہنچنے کے تمام مراحل میں آنے والی دشواریوں اور رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہونے میں مجھے حتی المقدور اور بھرپور تعاون دے کر ایک مشکل کام کو میرے لئے آسان بنا دیا

علاوہ ازیں اس کتاب میں شامل تمام افسانہ نگار خواتین و حضرات بھی تشکر و تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے میری آواز پہ لبیک کہا اور عدیم الفرصتی کے باوجود بہت کم وقت میں اپنی نگارشات مجھے ارسال کیں اور اس طرح اپنے عملی تعاون سے نوازا۔

عارفہ سلطان
صدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ پی. جی. کالج ٹونک (راج)

تاریخ ۔ ۱۰ راگست ۱۹۹۴ء

گل بلبل اور نیہا

پروین خان

چڑیوں کی چہچہاہٹ اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے ننھی نیہا کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ پہلے تو نیہا کی سمجھ میں آیا ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس کی عادت تو موٹروں اور بچوں کے رونے کے شور اور "اخبار والا جی" "دودھ والا جی" کی آوازوں کے ساتھ کھلتی تھی۔ پڑوس کے کسی باورچی خانہ میں جل رہے دودھ کی بو اور تیزی سے آجا رہے ٹریفک سے نکلے دھوئیں سے سارا ماحول بھرا رہتا تھا۔ تبھی اسے یاد آیا کہ وہ دہلی میں نہیں، جے پور میں ہے۔ اس کے والد سینٹرل گورنمنٹ میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے اور ان کا پروموشن پر ٹرانسفر اب جے پور ہو جانے کی وجہ سے وہ سب لوگ کل رات کو ڈیڑھ بجے ہی اپنے اس نئے گھر میں رہنے کے لئے آئے تھے۔ والد صاحب نے پہلے ہی جے پور آکر اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ انھیں سرکاری طور پر رہنے کے لئے سجا سجایا مکان کسی خوبصورت کالونی میں ملا تھا۔ اس لئے یہاں آتے ہی نیہا کے ابو جی اسے اپنا کمرہ دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ رات بہت ہو گئی ہے۔ سفر کی تھکان بھی ہے اس لئے اسے اچھے بچوں کی طرح سو جانا چاہئے۔ نیہا کا دل حالانکہ نئے گھر کو دیکھنے کو بہت چاہ رہا تھا۔ لیکن ایک تو ابو جی کا حکم تھا دوسرے اسے نیند بھی بہت آرہی تھی اس لئے وہ بستر پر لیٹتے ہی سو گئی۔ اب جو آنکھ کھلی تو جیسے دنیا ہی بدل گئی تھی۔ نہ تو موٹروں کے زور زور سے بجنے والے ہارن تھے نہ ان سے نکلنے والا کالا دھواں اور نہ ہی کوئی شور وغل۔ یہ جاننے کے

لئے کہ یہ چڑیوں کے شیریں نغمے اور پھولوں کی مہک کہاں سے آرہی ہے اس نے دوڑ کر بڑی سی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ ارے! یہ کیا؟ باہر تو اتنا خوبصورت باغیچہ تھا۔ جس میں رنگ برنگے پھول کھلے تھے، چھوٹی چھوٹی چڑیاں اِدھر سے اُدھر پھدک پھدک کر چل رہی تھیں۔ نیہا نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے گھر میں کوئی باغیچہ ہوگا اور اس میں اتنے پھول کھلے ہوں گے۔ تبھی اس کی نظر سامنے کھلے بڑے بڑے لال گلابوں پر پڑی۔ وہ حیران رہ گئی۔ اسے لال گلاب بہت پسند تھے اور ان کی خوشبو! واہ! خوشبو تو شاید دنیا میں کسی اور چیز کی ہوگی ہی نہیں۔ اس نے ایسے گلاب اکثر فلاور شاپ سے خریدے تھے اور اپنے کمرے کے گلدان میں سجائے تھے لیکن لاکھ کوششوں کے بعد بھی وہ ایک دو دن میں ہی مرجھا جاتے تھے۔

سامنے اتنے سارے لال گلاب دیکھ کر وہ خوشی سے کھل اٹھی۔ چپّل پہنے بغیر ہی وہ کمرے سے نکلی۔ ممّی نے آواز بھی دی مگر وہ یہ کہتے ہوئے کہ ابھی آئی۔ دوڑتی ہوئی باغیچہ میں آگئی۔

پھر پھر کر کے کئی چڑیاں ہڑبڑا کر صفائی سے کٹی ہوئی لان پر سے اڑ کر باغیچہ کے دوسری طرف چلی گئیں۔ نیہا نے چاہا سارے لال لال گلاب وہ ایک دم سے، اپنی جھولی میں بھرے مگر جیسے ہی اس نے ایک گلاب توڑنے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا قریب سے اسے ایک روحانی آواز سنائی دی۔ "نہیں نہیں گڑیا اسے نہ توڑو۔ دیکھو کتنے سارے کانٹے ہیں۔ تمہیں چبھ جائے گا۔ تو تمہارے ہاتھوں سے ایسا ہی لال لال خون نکلنے لگے گا۔"

نیہا نے چاروں طرف دیکھا وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ سچ تو ہے اس نے بے خبری میں کانٹے تو دیکھے ہی نہیں تھے۔ لیکن اسے اپنا ہمدرد تو کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک بار پھر سب سے بڑے اور خوبصورت گلاب کو توڑنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ تب ہی اسے پھر وہی آواز سنائی دی۔

"نہیں اچھی لڑکی پھول نہیں توڑو۔ پھول جب تک ٹہنی پر ہے وہ کھلا رہے گا۔ اگر تم اسے توڑ لوگی تو یہ جلدی ہی مرجھا کر اپنا رنگ، روپ اور خوشبو بھی کھو دے گا۔ تم تو پھولوں سے بہت پیار کرتی ہو جیسے تمہاری ممّی تمہیں پیار کرتی ہیں۔"

نیہا نے دیکھا اس کے پیروں کے پاس ایک بہت ہی خوبصورت چڑیا بیٹھی ہے۔ جس کی دم پر ایک بڑا گول پیسے کے برابر لال نشان ہے۔ وہی تو اس سے بات کر رہی ہے۔ نیہا نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"مگر تم کون ہو اور کیوں ان پھولوں سے اتنی محبت جتا رہی ہو؟"

"میں بُلبُل ہوں۔" چڑیا نے چہک کر کہا۔ "کیا تم مجھے نہیں جانتیں؟"

"ارے تم بلبل ہو!" سردیوں میں جب رات بہت لمبی ہوتی ہے اور ممی ہمیں رضائی میں اپنے پاس سلاتی ہیں تو ہم ان سے بہت سی کہانیاں سنتے ہیں اور وہ کبھی کبھی ہم سے پہیلیاں بھی پوچھتی ہیں۔ امیر خسرو کی ایک پہیلی ہے۔ "اِک جناور ایسا جس کی دم پر پیسا۔" کیا تم وہی بلبل ہو نا؟"

"ہاں میں وہی بُلبُل تو ہوں۔ تمہارا کیا نام ہے۔ تم میری دوست بنو گی؟"

"ہاں۔ ہاں ضرور! میرا نام نیہا ہے۔ نیہا یعنی پیار۔" نیہا تو جیسے خوشی سے پاگل ہو گئی۔

تب ہی ایک پتھر چھوٹی بُلبُل کے پاس آکر گرا اور بُلبُل گھبرا کر آکاش کی طرف اڑ گئی۔

"رُکو بُلبُل رُکو۔ سنو میری بات۔ سنو۔" نیہا زور سے چلائی۔

تب ہی اس کا بھائی ببلو غلیل ہاتھ میں ہلاتا ہوا آیا اور ڈپٹ کر نیہا سے بولا۔

"کیوں جانے دیا میرے شکار کو؟"

نیہا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بولی۔ "وہ تمہارا شکار نہیں تھی۔ وہ تو میری سکھی تھی۔ تم بہت برے ہو بھیا۔ اسے ستا کر تمہیں کیا ملا؟"

بات جھگڑے تک پہنچتی اس کے پہلے ہی ببلو کو باغیچہ کے دوسری طرف رکھا جھولا دکھائی دے گیا اور وہ نیہا کو چڑاتا ہوا اس طرف دوڑ گیا۔

اسی وقت نیہا اور ببلو کو ممی نے بلایا۔ "ارے بھئی! کچھ نہانے دھونے اور ناشتہ کا بھی خیال ہے۔ جلدی آؤ۔ دھوپ بھی چڑھ آئی ہے۔ اب باغیچہ میں شام کو جانا۔"

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد نیہا اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسے اپنا کمرہ بھی

تو ٹھیک کرنا تھا۔ اس نے اپنا سامان اور کپڑے الماریوں میں رکھ دئے۔ کتابوں اور کاپیوں کو بھی میز پر ڈھنگ سے سجا دیا۔ پھر کرسی کو اس نے اس طرح سے میز کے آگے رکھا کہ پڑھتے وقت روشنی اس کے الٹے ہاتھ کی طرف سے کتابوں اور کاپیوں پر پڑے۔ کونے والی الماری میں اس نے اپنی گڑیا "مینا" اور دوسرے کھلونے سجا دئے۔ دیوار کے سہارے وہ کیرم بورڈ بھی رکھ دیا جو ماموں جان نے اسے اس کی پچھلی سال گرہ پر تحفتاً دیا تھا۔ تب ہی اس کی نظر خالی گلدان پر پڑی۔ اس نے سوچا اب اسے، اس کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو دن بھر تازہ پھول اس کی کھڑکی سے نظر آتے رہیں گے۔ اس لئے گلدان لے جا کر ممی کے سامان میں رکھ دیا۔

بڑے بڑے لال گلاب ابھی بھی کھلے تھے۔ مگر سارے دن کے انتظار کے بعد بھی بُلبُل پھر بگیا میں نہیں آئی تھی۔ جب شام ہونے لگی تو نیہا باغیچہ میں آکر گلاب کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بہت اداس تھی۔ اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ "بُلبُل اب کبھی نہیں آئے گی۔ اس نے جھوٹ بولا۔ وہ میری دوست نہیں ہے۔"

"نہیں نیہا، بُلبُل ایسی نہیں ہے۔" اسے اپنے پاس سے لال گلاب کی آواز آئی۔ "بُلبُل تو دوستی، وفا اور قربانی کا دوسرا نام ہے۔"

"پر تمہیں کیسے معلوم؟" نیہا نے پوچھا۔

"آہا! تو یوں کہو نیہا رانی تم کچھ نہیں جانتیں۔ پتہ ہے میں کون ہوں؟"

"لو بھلا تمہیں کون نہیں جانتا؟ تم تو پھولوں کے راجہ ہو۔ راجہ لال گلاب۔" "تم ملکہ نورجہاں کا سنگھار ہو تو پیارے چاچا نہرو کا دلار بھی۔ تمہارا رنگ، روپ اور خوشبو کس کو اچھی نہیں لگتی۔ بڑے سے بڑا باغ ہو یا چھوٹی سے چھوٹی بگیا۔ تمہارے بنا سونی ہی رہتی ہے۔"

"ہاں تم نے ٹھیک کہا نیہا مگر کبھی میں بنا پھولوں والا صرف کانٹوں بھری ایک شاخ تھا مجھ پر یہ لال لال مست خوشبو والے پھول تو بُلبُل کی بے مثال قربانی سے ہی کھلے ہیں۔"

"کیا سچ پہلے یہ خوبصورت گلاب نہیں تھے؟" حیرانی سے نیہا نے کہا۔

"ہاں نیہا۔ بُلبُل کی وجہ سے ہی یہ پھول مجھ پر کھلے ہیں۔"

"اچھا وہ کیسے؟ مجھے وہ کہانی سناؤ نا لال گلاب۔" نیہا کی حیرانی اور بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔

"سالوں بہت سال پہلے" لال گلاب نے کہنا شروع کیا۔ "گلاب صرف گلابی رنگ کے ہی ہوتے تھے۔ جیسا تم جانتی ہو۔ ان میں نہ مجھ جیسی خوبصورتی ہی ہوتی تھی اور نہ ہی خوشبو۔ برسات کی ایک رات کی بات ہے۔ گہرے کالے بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ کہیں کوئی تارا یا روشنی نہیں تھی۔ بادلوں کی گرج سے شیروں کا دل بھی کانپ اٹھا تھا۔ ڈر کے مارے سارے چرند پرند اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبک کر بیٹھے تھے۔ جن جانوروں کے گھروں میں یا گپھاؤں میں تھے انھیں باڑھ کے پانی کا ڈر تھا' تو جن کے پیڑوں کے کھوکھلے تنوں اور ڈالیوں پر تھے انھیں تیز ہوا سے پیڑوں کے گرنے کا خدشہ۔ بھاری گھن گرج اور تیز ہوا کے ساتھ اب اولے بھی پڑنے لگے۔ ایسے ہی ایک پیڑ پر بلبل نے بھی اپنا گھونسلہ بنایا تھا۔ مگر ہائے رے قسمت! درخت کے ٹوٹنے سے وہ بھی گر کر بکھر گیا۔ پانی' سردی اور اولوں سے بچنے کے لئے بلبل ایک ایک بیل ایک ایک جھاڑی اور درخت کے پاس گئی لیکن سب کو اپنی ہی پڑی تھی۔ سب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم سے اپنا ہی بوجھ نہیں سنبھالا جارہا۔ تمہارے وزن سے ہماری شاخیں اور ٹوٹ جائیں گی۔

ناامید اور لاچار بلبل کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر جاتی مگر کسی نے اسے سر چھپانے کو جگہ نہیں دی۔ میری طرف تو اس نے دیکھا بھی نہیں۔ مجھ کانٹوں کے جھاڑ سے تو سبھی نفرت کرتے تھے۔ پھر بھی مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے کہا سنو بلبل۔ میں ان بڑے درختوں کی طرح مضبوط تو نہیں ہوں کہ تم مجھ پر اپنا گھونسلہ بنا سکو۔ میرا سارا جسم بھی نکیلے کانٹوں سے بھرا پڑا ہے۔ تمہیں میری شاخوں پر کوئی آرام تو نہیں ملے گا۔ پھر بھی آؤ میرے پتوں میں چھپ جاؤ۔"

مرتا کیا نہ کرتا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ناچار سردی سے ٹھٹھرتی بلبل جلدی سے میرے پتوں میں آچھپی۔ میں نے اپنے کانٹوں کو سکوڑ کر سانس تک روک لی کہ کہیں میرے ہلنے سے کوئی کانٹا بلبل کو چبھ نہ جائے۔ دھیرے دھیرے طوفان کا زور بھی تھمنے لگا اور سویرا ہوتے ہی سورج کی سنہری گرم دھوپ چمک اٹھی۔ بلبل نے دھیرے سے

اپنی آنکھیں کھولیں اور انگڑائی لے کر میری اوپر والی شاخ پر جا بیٹھی۔ بارش اور سردی سے اس کا سارا جسم اکڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "کچھ دیر اور سستا لو۔ جب ٹھیک ہو جاؤ تب ہی جانا۔"

" بلبل تو تھکی تھی ہی آنکھیں بند کر کے سو گئی۔ تبھی میں نے دیکھا راجہ کا ایک شکاری اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے جیسے ہی بلبل کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا میں نے زور سے اپنے کانٹے اس کے چبھو دئے۔"

" واہ! تم نے بہت اچھا کیا لال گلاب۔ مگر وہ شکاری بلبل کو کیوں پکڑنا چاہتا تھا؟ " نیہا بولی۔

" رانی بیٹا " لال گلاب نے جواب دیا۔ " اس ملک کے راجہ کا بیٹا چھوٹا سا راج کمار تھا۔ اسے رنگ برنگے ہرے، نیلے پیلے لال پرندے بہت پسند تھے۔ وہ بہت سست تھا اس لئے جنگل میں جا کر پرندوں کو دیکھنے کے بجائے وہ انھیں شکاریوں کے ہاتھوں پکڑوا کر سونے چاندی کے پنجروں میں بند کر لیتا تھا۔ سبھی پنجرے اس کے کمرے میں لٹکے رہتے تھے تاکہ ان سے پرندوں سے وہ کبھی بھی بات کر سکے۔ اس کے پاس طوطا مینا لال سبھی پرندے تھے مگر کوئی بلبل نہیں تھی۔ اس لئے اس نے اعلان کروا دیا تھا کہ جو بھی اسے پکڑ کر لا دے گا اسے انعام دیا جائے گا۔"

" اوہ! پھر تو سارے پرندے راج کمار کی قید میں تھے۔ کیا راج کمار کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس سے معصوم پرندوں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے؟ " نیہا نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔

" معلوم کیوں نہیں تھا لیکن بڑے ہی کیا کبھی کبھی بچے بھی خود غرض ہو جاتے ہیں۔ راج کمار کو بھی اپنی خوشی کے سامنے ان کی تکلیف کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔"

" پھر کیا ہوا؟ کیا شکاری نے بلبل کو پکڑ لیا؟ " نیہا نے جلدی سے پوچھا۔

" ہاں بھی اور نہیں بھی " کیوں کہ میرے کانٹوں کے درد کو دبا کر بھی وہ موذی بلبل پر جھپٹ پڑا۔ اتنے میں بلبل کی آنکھ کھل گئی۔ وہ زور سے چھٹپٹائی اور چلائی۔ " پیارے گلاب میں تم سے دور نہیں جانا چاہتی اور پھر غلامی کی زندگی سے موت بھلی۔ تم نے ساری رات میرے

بڑی تکلیف اٹھائی۔ تم نے مجھے آسرا دیا۔ اب سے تم پھولوں کے راجہ کہلاؤ گے۔ یہ کہہ کر وہ میرے کانٹوں سے لپٹ گئی۔ جیسے ہی کانٹے چبھے اس کے جسم سے لال خون نکل کر میری ڈال ڈال پر جا پڑا۔ شکاری نے مردہ بُلبُل کو چھوڑ دیا۔ جس بُلبُل کی میں نے رات بھر سانس روک کر حفاظت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا یہ انجام دیکھ کر میں سارا دن روتا رہا مگر دوسرے دن میں حیرت اور مسرت سے ششدر رہ گیا۔ کیوں کہ میری جس جس شاخ پر بُلبُل کے خون کی بوندیں گری تھیں وہاں بڑے بڑے لال لال پھول کھل اٹھے تھے۔ جن کی مست خوشبو سے سارا ماحول مہک اٹھا تھا۔ میرے آس پاس کے پیڑ پودے کہہ رہے تھے۔ "ارے وہ دیکھو پھولوں کا بادشاہ۔ پھولوں کا راجہ۔ لال گلاب۔"

" تب ہی پھر سے اڑ کر بُلبُل نیہا کے پاس آ بیٹھی۔ نیہا تو خوشی سے جھوم اٹھی۔ کہنے لگی۔

" واہ بُلبُل تم کتنی عظیم ہو۔"

" نہیں نیہا عظیم تو کانٹوں بھرا گلاب ہی ہوا نا! اس دنیا میں ہم سبھی ایک زنجیر کی چھوٹی چھوٹی کڑیاں ہیں جن کی اپنی اپنی جگہ پر ایک خاص حیثیت ہے۔ چاہے وہ پھول ہوں یا کانٹے۔ جانور ہوں یا انسان۔ کسی بھی ایک کڑی کے ٹوٹنے سے قدرت یا کائنات کی یہ زنجیر ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ جس کو جوڑے رکھنے کی ذمہ داری ہم سب پر ہے۔ چاہے کچھ بھی سے قربانی دینی پڑے۔ بُلبُل نے کہا۔

" تمہاری بات میری سمجھ میں کچھ کچھ آ رہی ہے۔ تم میری سہیلی ہو۔ تم یہیں رہو۔ اب کبھی بھی یہاں سے نہ جانا۔ ممی نے بھیا کو سمجھا دیا ہے۔ وہ کبھی تمہیں نہیں ستائیں گے "

" اس پر بُلبُل بولی۔ " مگر میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں؟ میں تو اپنا گھونسلہ بڑے بڑے درختوں کی شاخوں پر بناتی ہوں۔"

نیہا نے دیکھا وہاں چھوٹی جھاڑیاں پودے تو بہت تھے لیکن کوئی بڑا پیڑ نہیں تھا۔ نیہا نے کہا " میں اگاؤں گی یہاں بڑے بڑے پیڑ جو سب کو سایہ دے سکیں اور اس پر اپنا اپنا گھر بنا سکیں۔ انھیں تحفظ مل سکے۔"

بُلبُل خوش ہو کر بولی۔ " ہاں نیہا تم کل ہی ایسے درخت لگانا۔ سب کو آسرے اور

ظاہر ہو رہے تھے۔ اس وقت اگر کوئی ذرا فاصلے سے چپکے چپکے دیکھتا تو ان کی سادگی اور معصومیت پر عش عش کر اٹھتا۔ ایوارڈ کمیٹی کے ممبران اگر انھیں اس طرح دیکھتے تو یقینی طور پر متفقہ رائے سے ان تینوں کو بیک وقت بہترین اداکاری کے انعامات سے نوازتے۔ یہ تینوں ابھی اپنے اس کھیل میں پوری طرح ڈوبے ہوئے تھے کہ اچانک ہی ایک بونڈر اٹھ کھڑا ہوا۔

لوگ اپنی پوری طاقت اور رفتار کے ساتھ جھونپڑوں اور گھروں کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔ ان کے جوتے، چپل اور سائیکلیں تک پیچھے چھوٹ چلی تھیں۔ گر کر گھٹنے چھلنے اور چوٹ کھانے کے باوجود کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہ گیا تھا۔ سب کے سروں میں بس ایک ہی دھن سوار تھی — جیسے بھی ہو گھر پکڑا جائے۔ دس بیس یا سو پچاس قدم کا فاصلہ بھی اس وقت ان لوگوں کو میلوں لمبا لگ رہا تھا۔ کیا ہو چلا ہے؟ اس ایک سوال کا جواب تک دینے کی فرصت کسی کو نہ تھی۔ لوگ بس بھاگ رہے تھے اور بھاگے چلے جا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑکیں اور گلیاں سونی ہو گئیں۔ ہر کوئی اپنا دروازہ بند کر کے اندر دبک گیا تھا۔ باہر گلی کوچے میں آوارہ جانوروں کے علاوہ اب کوئی نہ تھا۔

کیا ہوا ہے' یہ سوال اب بے معنی ہو چلا تھا۔ ہر کوئی جان چکا تھا کہ فساد بھوٹ پڑا ہے۔ اور اب اس علاقے میں بھی کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ہر کوئی ڈرا' سہما ہوا اپنی جائے رہائش میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ جن کے کمانے والے ابھی لوٹے نہیں تھے وہاں سوگ کا سا ماحول بن گیا تھا۔ یہ تو غنیمت تھا کہ علاقے کے اسکول میں چھٹی کی گھنٹی بجے دیر ہو چکی تھی اور بچے گھروں کے آس پاس یا پھر اندر ہی تھے ورنہ تو غضب ہو گیا ہوتا۔ پھر بھی ایک گھر اور دو جھونپڑوں میں ماتم کا سا ماحول چھایا ہوا تھا۔ یہاں کے تین بچے باہر رہ گئے تھے۔

اور یہ تینوں بچے حالات اور ماحول سے بے خبر اس وقت بھی کھنڈرات میں کھیلنے میں مست تھے۔ انھوں نے اب اپنے کھیل کی نوعیت اور جگہ بدل ڈالی تھی۔ یہ اب ٹوٹے پھوٹے چھپر تلے ڈاکٹر اور مریض کے رول نبھانے میں مصروف تھے۔ ایک لڑکی مریضہ بنی فرش پر لیٹی کراہ رہی تھی۔ لڑکا اس کی کلائی تھامے ڈاکٹر بنا ہوا نبض ٹٹول رہا تھا۔ دوسری

لڑکی جب کہ نرس کی صورت میں ان دونوں کے نزدیک ہی کھڑی تھی۔

ڈرے ہوئے لوگ اِدھر اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے جان ومال، آل اولاد کی حفاظت اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ انھیں میں ان تینوں بچوں کے والدین بھی تھے۔ بچوں کی ماؤں کا برا حال تھا۔ وہ متواتر روئے جارہی تھیں۔ ان عورتوں نے باہر نکل کر خود ہی بچوں کو ڈھونڈ نکالنے کی ضد بھی پکڑی لیکن گھر کے دیگر افراد کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔

لوگ ڈرے ہوئے تھے لیکن انھیں اس بات کا یقین بھی تھا کہ اس علاقے میں کچھ نہ ہوگا۔ یہ لوگ کئی کئی بار چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر جھگڑا کر لینے کے باوجود ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آتے تھے۔ یہ بات ان لوگوں کے لئے بعید از قیاس تھی کہ ایک گھر دوسرے گھر کا اور ایک دیوار دوسری دیوار کی دشمن بھی ہو سکتی ہے۔

اتنے میں دور سے ایک شور سنائی دیا جو دیکھتے ہی دیکھتے نزدیک آتا چلا گیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہاں چیخ پکار مچ گئی۔ آن کی آن میں جھونپڑوں سے آگ اور دھواں اٹھنے لگا۔ سڑکوں پر بھگدڑ مچ گئی۔ گروہ کی صورت دور سے آئے ہوئے اجنبیوں نے بے گناہ اور بے قصور لوگوں پر تیز دھار دار ہتھیاروں سے وار پر وار کرنے شروع کر دئے۔ ان کے ہاتھوں کی مشعلیں جھونپڑوں اور دکانوں کو نذرِ آتش کرنے کے علاوہ لوگوں کو جھلساتی بھی جارہی تھیں۔ جگہ جگہ قتل و غارت گری کے مناظر پیدا ہو گئے۔ علاقے کے لوگ کچھ سمجھ نہیں پارہے تھے کہ کیا کیا جائے۔ ہر کسی کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ بدحواسی کے عالم میں گرتے پڑتے لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ لیکن انھیں اس عذاب سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

اچانک ہی چار پانچ جیپیں ادھر نکل آئیں اور باوردی پولیس نے اس افراتفری کو اپنے طریقے سے قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ ڈنڈے برسائے گئے۔ اشک آور گیس چھوڑی گئی۔ اس سے بھی جب کام نہیں چلا تو رائفلیں کام میں لائی جانے لگیں۔

"پٹاخے چھوٹ رہے ہیں!" کھنڈر میں کھیلتے معصوموں میں سے ایک نے کہا۔

"دیوالی ہے کیا؟" چھوٹی لڑکی نے سوال کیا۔
"دیوالی تو ابھی گئی ہے۔" لڑکے نے کہا۔ "کسی کی شادی ہے!"
"چلو، دیکھتے ہیں!"

اور وہ تینوں امنگ کے ساتھ چھپر تلے سے نکل کر کچی دیوار کی طرف آگئے۔ لیکن ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کی اوٹ سے انھوں نے جو کچھ بھی دیکھا وہ ان کے لئے قطعی طور پر غیر متوقع اور بڑا ہی بھیانک تھا ۔۔ چار انسانی جسم اپنے ہی خون میں لت پت بے حس و حرکت سڑک کے عین بیچ میں اور نالیوں کے پاس پڑے تھے۔ کچھ لوگ زخمی حالت میں کراہ رہے تھے۔ آگ اور دھویں کے بیچ کہرام مچا ہوا تھا۔ "وردیاں" اپنا کام کر رہی تھیں ......

اس دہشت ناک منظر کی تاب نہ لا سکنے کے سبب وہ تینوں فوراً ہی واپس چھپر تلے چلے گئے۔ ڈرتے ہوئے وہ وہاں ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو انھوں نے اس علاقے میں کئی دفعہ دیکھے تھے۔ لیکن ایسے خوفناک اور خوں ریز منظر ان کی آنکھوں کے سامنے پہلی بار آئے تھے۔

اِدھر باہر آگ اور دھوئیں کے بیچ چیخنے چلانے اور رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ زخمی اور مردہ جسم وردی والوں کی وین میں رکھے جا چکے تھے۔ ایک وین میں گرفتار کئے گئے لوگ تھے۔ اب ہر طرف وردیوں کی آمد و رفت تھی۔ اس دوران گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔

خوف اور بھوک پیاس نے ان تینوں کو اِدھر چھپر تلے بے حال کرنا شروع کر دیا تھا۔ انھیں اپنے ماں باپ اور گھر کے دیگر افراد شدت کے ساتھ یاد آنے لگے اور وہ اپنے گھر پہنچنے کے لئے بے چین ہو اٹھے۔ سہمے سہمے اسی غرض سے وہ تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے وہاں سے نکل کر اینٹوں کی چھوٹی سی دیوار کی طرف آگئے۔

باہر دھواں ضرور اٹھ رہا تھا لیکن اب ہر طرف خاموشی تھی۔ وردیوں کی سخت تنبیہوں کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔ وردیاں پوری طرح سے چاق و چوبند تھیں۔
اتنے میں ایک وردی دھاری نے دیکھا کہ کوئی چھپا ہوا سر اٹھانے کی کوشش کر رہا

ہے ۔ وردی کی آنکھیں اس طرف گڑ کر رہ گئیں۔ اس نے سوچا کہ کوئی دیسی بم یا تیزاب پھینکنے کی فراق میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رائیفل سے نشانہ باندھ کر للکارا ــــ کون ہے؟ سیدھے سیدھے ہاتھ اونچے کر کے باہر نکل آؤ ورنہ گولی مار دی جائے گی!.....

جواب میں وہ سر فوراً ہی چھپ گیا۔ یہ دیکھ کر "وردی" کو یقین ہو گیا کہ دراصل حملہ کر دینے کا موقع دیکھا جا رہا ہے۔ چند لمحوں کے وقفے سے وہی سر پھر نظر آیا تو "وردی" نے نشانہ سادھ کر بے جھجک فائر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سر وہاں سے غائب تھا۔ کچھ پل بعد وہی وردی اسی طرح نشانہ جمائے ہوئے سر والے مقام کی طرف بڑھ کر اس نے وہاں دیکھا ــ چھوٹی سی دیوار کے اس طرف ٹوٹی پھوٹی اور بے ترتیب اینٹوں کے بیچ دو معصوم سر گولی لگی ایک لڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے سفید چہرے لئے اس کی طرف دیکھ رہے تھے.......

پسِ پردہ کوئی پکارتا ہے

حسن جمال

گلیارے میں ملگجا اندھیرا تھا۔ ٹھہرو دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اکرم بھائی کے لئے راستہ دینا تھا۔ بھاری جسم والے اکرم بھائی دیر تلک بیٹھے رہنے کی وجہ سے گویا لڑکھڑا گئے یا ارادتاً انھوں نے ایسا کیا۔ لیکن خود ٹھہرو کو کیا ہوا تھا۔ اکرم بھائی کا مردانہ ہاتھ جب ٹھہرو کی نازک کلائی سے چھوا تو اس کی صندلی ہتھیلی آپ ہی آپ ایک مضبوط پنجے سے لپٹ گئی۔ بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ کیا وہ خواب میں تھی ؟ اکرم بھائی کی نزدیک آتی تمباکو آمیز سانس سے، ان کی توند کا دباؤ، جلتے ہوئے ہونٹ۔ گویا ہونٹوں میں سگریٹ دبی تھی۔

دور بیٹھک سے امّی کی پکار۔ "ٹھہرو! اکرم میاں چلے گئے کیا ؟"

"ہاں امّی!" اسپرنگ کی طرح چھٹک کر دور ہو گئی ٹھہرو۔ "دروازہ بند کر کے آئی امی" ٹھہرو پر کپکپی طاری تھی۔ یا اللہ! یہ کیا ہو گیا ؟ کیسے ہو گیا ؟ کیوں ہو گیا ؟ اکرم بھائی نے ایسا کیوں کیا ؟ خود اس نے اپنے آپ کو سنبھالا کیوں نہیں ؟ کیا امّی جان نے دیکھ لیا ؟ آواز کیوں دی ؟ کیا انھیں شبہ ہو گیا تھا ؟

اکرم بھائی جا چکے تھے۔

امّی تخت پر بیٹھی پان کی آخری گلوری منہ میں رکھ رہی تھیں۔ جانماز پاس ہی رکھی تھی۔ پانی کا جگ بھی۔ عشا کی تیاری تھی۔

"سلیمان بلا رہا ہے تجھے، دیکھیو۔ کیا کام ہے ؟ کوئی تجھے چین نہیں لینے دیتا بیٹی۔"

امّی نے پاندان کو ایک طرف سرکاتے اور گلوری کو چباتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا تو امّی نے کچھ نہیں دیکھا؟ مہرو نے ایک لمبا سانس لیا۔ اس سے پہلے کہ امّی اس کے جسم کی کپکپی کو بھانپ لے، وہ دالان کو پار کرتی ہوئی سلیمان کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"کیا چاہیے؟"

سلیمان اس سے چھ برس چھوٹا تھا اور آپا کو کسی کام کے لئے کہتے ہوئے ہمیشہ سر کھجانے لگتا تھا۔ "وہ کیا ہے آپا! آپ کی بھابھی کے سر میں درد ہے۔ ذرا لیمو والی چائے بنا دیجئے نا۔ ہاں، ذرا سونٹھ بھی ڈال دیجئے گا، پلیز!"

سلیمان کے ہاتھ میں انگریزی جاسوسی ناول تھا اور وہ مونڈھے پر آرام سے پسرے ہوئے تھا۔ بھابھی جان دوپٹے کو سر پر لپیٹے کسی شاہزادی کی طرح دراز تھیں۔ غرارے کے پائنچے کچھ اوپر اٹھ آئے تھے۔ ان کی گوری پنڈلیوں پر جا بجا ہلکے روئیں چھترائے ہوئے تھے گویا پنڈلیوں کو نظر نہ لگ جائے کہیں!

بھابھی جان کے پاؤں بے حد خوبصورت تھے ــــ آپ کے پاؤں بہت حسین ہیں انھیں زمین پر مت اتاریئے گا، میلے ہو جائیں گے ــــ

"آپا، آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں، میں ہی ......" بھابھی جان نے جھوٹ موٹ اٹھنے کا بہانہ کیا۔ "آپ آرام کیجئے۔ میں لاتی ہوں۔" مہرو الٹے پاؤں کچن کی طرف دوڑی۔

کچن اس کی پناہ گاہ تھی۔ دھیمی دھیمی آنچ کو دیکھ کر اس کو سکون ملا جیسے وہ خود دھیمی آنچ ہے جو برسوں سے سلگ رہی ہے۔ چپ چاپ .... بے آواز ....

اس نے ڈیڑھ کپ چائے تیار کی۔ ایک کپ بھابھی جان کے لئے آدھا کپ سلیمان کے لئے۔ "چائے حاضر ہے۔ ٹن ٹناٹ۔" چائے کے گرم مگ انگلیوں میں پکڑے ہوئے وہ کمرے میں گھسی تو اسے لگا، اس کے قدموں کی آہٹ پا کر سلیمان ابھی ابھی واپس مونڈھے میں جا دھنسا۔ بھائی کی پیٹھ دکھی تھی۔ بھابھی کی اگھڑتی ٹانگیں "ہٹیے بھی آپ کو مسخری سوجھ رہی ہے اور میرا سر دکھ رہا ہے۔"

"تھینک یو آپا!" سلیمان کے ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ تھی۔ "آپ کتنی اچھی ہیں۔"

" میں — کیا ؟ " مہرو نے کنکھیوں سے سلیمان کی دلہن کو سنجیدگی سے دیکھا اور الٹے پاؤں لوٹ آئی۔ اسے فلیٹری پسند نہیں۔ کام۔ بس کام۔ وہ اپنا ہر لمحہ کام میں جھونک دینا چاہتی ہے۔ کچھ کرنے کو نہ ہو تو ہر لمحہ بوجھ بن جاتا ہے اس کے لئے۔

" مہرو، زرا آیوڈکس تو لانا۔ " ابّو کی آواز تھی۔ وہ اپنی اسٹڈی پوری کر چکے ہوں گے۔ شاید سونے کی تیاری ہے۔ ان کے گھٹنے کئی برسوں سے آیوڈکس کے محتاج ہیں۔

" آئی ابّو۔ " دوڑی آواز کی سیدھ میں۔

ابّو پلنگ پر دراز گھٹنے سیدھے کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

" لائیے میں مل دوں۔ "

نہیں رہنے دے بیٹی۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ تو جا۔ تیری امّی کہاں ہیں ردّو آیا ؟ "

" امّی تو تخت پر بیٹھی اُونگھ رہی ہیں۔ ردّو ابھی نہیں آیا۔ "

" ردّو کبھی وقت پر نہیں آتا۔ "

مہرو خاموش رہی۔ زرا ٹھٹھکی۔ " کچھ اور چاہیئے ابو ؟ "

" نہیں مہرو۔ تو جا۔ "

مہرو پھر کچن میں۔ کبھی کبھی تو اسے محسوس ہوتا، وہ مہرو نہیں مہری ہے اس گھر کی۔ چولہا چوکا، صفائی دھلائی سبھی اس کے ذمّے۔

گیارہ بجنے کو آئے۔ لاٹ صاحب ابھی آئے نہیں۔ اُوپر سے کھانا گرم چاہیئے۔ سب خرّاٹے لے رہے ہوں گے۔ اسی کو جاگنا پڑے گا انتظار میں — دیکھو، آج حضرت کب آتے ہیں ؟ کچن کا آخری سنبھالا کر وہ امّی کے پاس پہنچی۔ ان کا سر لڑھک گیا تھا۔ تکیہ ٹھیک کیا۔ ان کی بغل میں اپنا بستر لگا رہی تھی کہ زور سے گھنٹی ٹن ٹنائی۔ " ہتھوڑے کی طرح ہاتھ ہے کمبخت کا۔ "

ساتھ میں آواز بھی — " آپا، مہرو آپا "

" آئی بابا۔ "

"یہ کوئی وقت ہے؟" دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا چہرو نے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سوال کا جواب کبھی نہیں ملتا۔

"بھوک لگی ہے آپا۔ کیا بنا ہے؟"

اس گھر میں ہر کوئی اپنے مطلب کی بات کرتا ہے۔ کبھی کوئی اس سے نہیں پوچھتا کہ اسے کیا چاہئے جیسے اس کا وجود صرف "خدمت" کے لئے ہے۔ خدمت کے سوا کچھ نہیں۔

لیکن یہ اکرم بھائی!

رونو کی بے شکریہ ڈکاروں کے بعد امی کی بغل میں لیٹی چہرو کو اکرم بھائی جھنجھوڑنے لگے۔ اسے محسوس ہوا' برسوں سے گرد آلود مضراب کے تار اچانک چھیڑ دئے گئے ہیں۔ ایک سرد اور گرد آلود مضراب۔ اکرم بھائی جیسے سنجیدہ شخص نے یہ حرکت کیوں کی؟ کیا وہ جانتے نہیں کہ میں ان کے بزنس پارٹنر کی بیٹی ہوں۔ کیا ایسا شخص کسی شریف گھرانے میں آنے جانے لائق ہے؟ اگر میں ابو سے شکایت کردوں تو؟ یا امی سے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرپائے گی۔ وجہ نہیں جانتی۔ شاید کچھ کچھ سمجھتی ہے۔ اس کا جسم بہر حال اس کا ہے۔ اکرم بھائی کی موٹی انگلیوں کا لمس' ان کے جلتے ہوئے موٹے ہونٹ اور ان کی تمباکو آمیز گرم سانسیں۔ ایک تکیہ اس نے گھٹنوں نیچے لے لیا۔ مضراب کے تار ابھی تک جھنجھنا رہے ہیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے وہ ان کی آغوش میں پڑی ہے۔ نہیں لگ نہیں رہا' محسوس کرنا چاہتی ہے۔ مگر کیوں چاہتی ہے وہ ایسا؟ یہ سراسر گناہ ہے۔ اکرم بھائی کون ہوتے ہیں اس کی خاموش زندگی میں پتھر پھینکنے والے۔ ایسی حرکت پہلے کسی نے نہیں کی۔ سنیل' الطاف نے بھی نہیں۔ اس کے باس نے یا کسی اور نے۔ ہمیشہ خود کو بچا کر رکھتی آئی ہے وہ۔ مگر کس سے؟ کیا خود سے؟ یا اوروں سے؟ اور بچا کر کیا حاصل کیا؟ ہم خود کو خود سے بچانے کی خوش فہمی میں کیا خود کو کھوتے نہیں رہتے؟ مٹھی سے رستی ریت کی طرح۔ ریت جسے ہم دوبارہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس طرح نہیں جس طرح پہلے اٹھائی گئی۔

جب عمر کے ساتھ بہاریں اٹھکیلیاں کررہی تھی تب تو ابو امی کے دماغ ساتویں

آسمان پر تھے۔ گریجویشن کر لیا تب بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"جناب! ابھی تو ہماری مہرو پڑھ رہی ہے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہاں۔ ہاں آپ کا لڑکا گلفام ہے۔ اس کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل جائے گی۔ مگر ہماری مہرو ایک ہی تو بیٹی ہے ہماری۔ چندے آفتاب و چندے ماہتاب۔ صاحب، ابھی نسبت کے لئے مت کہئے۔"

بعد میں نسبت لے کر آنے والوں میں سو سو کیڑے نکالے جاتے۔ چلے آئے مہرو کا رشتہ مانگنے۔ اپنی حیثیت دیکھی انھوں نے؟ ہم سیّد زادے۔ کیسے دے دیں اپنی بیٹی اس گھرانے میں؟ لڑکے کو دیکھا کبھی آپ نے گہرا سانولا۔ ناک بھی ایسی لمبی۔ ان لوگوں کے پاس پیسہ تو ہے مگر عزّت ــ نا بابا نا ــ یاد کر کے ہنسنے لگتے امّی ابو۔ اور ریت مٹھی میں سے رستی رہی۔ اس کے چنچل دل میں خوابوں کی جو کلیاں چٹختی جا رہی تھیں، ایک ایک کر کے مرجھانے لگیں۔ غزالہ، رخسانہ، جمیلہ، میرا، سونو ــ ایک ایک سہیلی کو انہی سونی آنکھوں سے وداع کیا تھا۔ اس امید میں کہ کبھی وہ بھی دلہن بنے گی، سہاگ کا جوڑا پہنے گی، اس کی بھی ڈولی اٹھے گی۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ آئے گا اور ....

"کون! کون ہو تم؟"

"میں ــ میں سنیل اروڑا۔ نہیں پہچانا مجھے؟ کیا مجھے بھول گئیں؟"

گورے چٹے، قد آور، خوبرو سنیل کو کیا کبھی بھول سکتی ہے وہ؟ مگر تم کیوں چلے آئے؟

"تم نے یاد کیا اس لئے۔ کیسی ہو؟" تکیہ اور کس کر بھینچ لیا۔

سنیل اس کا کلاس فیلو تھا۔ یہ کہنا اس کی حیثیت کم کرنا ہے۔ جسے پہلی محبت کہتے ہیں وہ سنیل ہی تھا۔ لیکن چاہتوں کے ڈھب ہمیشہ عجب کیوں ہوتے ہیں؟ یہ سوچتی تھی تب۔ کیوں نہیں سنیل کی جگہ کوئی عمران، کوئی امجد، کوئی احمد ہوا؟

"مائی چارمنگ کولڈ کافی! تم تو کولڈ ہی لوگی نا!" کافی شاپ میں اس کی گوری ہتھیلی پر ہاتھ رکھتے ہوئے سنیل مسکراتا تھا .... اس کا چہرہ نہیں، صرف آنکھیں .. صرف آنکھیں۔

"تم ہمیشہ یہ سوال کیوں کرتے ہو؟"

"اس لئے کہ کبھی تو گرم ہو جاؤ ـــــ ہاٹ بھاپیں نکلتی ہوں تمہارے انگ انگ سے بخار کی طرح۔ ویسے تمہارے لئے میں ہوں کیا؟"

"گرم نہیں۔ صرف نرم۔ لچیلی شاخ کی طرح۔ میں جانتا ہوں' یہ شاخ کبھی میری منڈیر کی طرف نہیں جھکے گی۔ تمہارے ابّو بہت سخت اور قدامت پسند ہیں۔ چلو بھاگ چلیں"

"میں ابّو سے بھی سخت ہوں ـــ ماروں گی ہاں! پھر کبھی ایسی بات کی تو۔ ہمارے خاندان میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"جانتا ہوں بھئی۔ تمہارے خاندان میں گھٹ گھٹ کر مرتی ہیں تمہاری جیسی لڑکیاں۔ کبھی خاندان کا وقار آڑے آئے گا' کبھی لڑکے میں عیب نکالے جائیں گے اور کبھی اپنی کمزور پوزیشن چھپانے کی ناکام کوششیں ہوتی رہیں گی۔ بیٹی کے کیا ارمان ہیں' جانے ان کی بلا۔ لوگ تو ڈرائنگ روم میں بھی بے جان عورت کی ساج سنبھال کر لیتے ہیں مگر ......"

"مجھے ڈراؤ مت۔ پلیز سنیل!"

"حقیقت بیان کر رہا ہوں کولڈ کافی۔ میری تجویز نہیں مانوگی تو یاد رکھنا' ساری زندگی کے لئے کولڈ بن جاؤگی۔ ڈارلنگ! ابھی وقت ہے۔ میرے ساتھ آجاؤ' تمہاری زندگی سنوار دوں گا۔ میں بہت جلد دُبئی جانے والا ہوں۔"

"بدنامی کی قیمت پر' میں کچھ بھی قبول نہیں کروں گی ـــ یاد رکھو ـــ میں سیدزادی ہوں ـــ انڈر اسٹینڈ؟۔ ابھی مجھے اپنی تعلیم پوری کرنی ہے۔"

اور تمہاری سو کالڈ تعلیم جب مکمل ہو چکے گی تب تمام لڑکے پُھر ہو چکے ہوں گے۔ پھر حسرت سے تاکتے رہنا آئینے میں اپنا کولڈ کولڈ سا چہرہ۔ سفید تنکے چن چن کر۔ تعلیم ہے کہاں تم لوگوں میں؟ کیا سوچ کر تمہارے فادر نے تمہیں یونیورسٹی بھیجا۔ ایں! ۔ کوئی لڑکا کس کارخانے میں ملازم ہے۔ کوئی باپ کی کمائی پر آوارہ گردی کر رہا ہے اور کسی کو تانگہ ٹیکسی چلانے میں بھی عار نہیں۔ پیسہ خوب کوٹ لیں گے۔ لیکن تعلیم۔ تمیز۔ تہذیب۔ ادب لوگ یہ سب حاصل کرنے لگیں گے تو بے چارے دوسرے کہاں جائیں گے؟ سنو' مائی ڈیر

کولڈ کافی! کتنا اچھا لگے گا جب تم کسی دن کسی ٹیکسی والے خاں صاحب کے ساتھ بے زبان جانور کی طرح بیاہ دی جاؤگی' جو دن رات بے دردی سے تمہارے بھونپو بجایا کرے گا۔ جسم کے بھی اور ــــ روح کے بھی ......"

"یوشٹ اَپ۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ غصّہ اور خفگی سے۔

جب سنیل ڈبئی چلا گیا تو کئی مہینوں تک اس کے پیارے خط آتے رہے۔ لائٹ بلیو کلر کے باریک لیٹر ہیڈ پر۔ "میرے پہلے پہلے پیار کے لئے۔ مائی چارمنگ کولڈ کافی کے لئے اور سناؤ مہرالنسا، کوئی تیار ہوا؟"

وہ کبھی تخفوں سے کو کبھی سنیل کے چہرے کو دیکھنے لگتی۔ جی کرتا تھا وہ اس پو بوس سے پڑے۔ مگر بوس ٹوٹنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ سنیل اس کی کمزوری تھا۔

وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی۔ "تمہارے لئے اب کوئی چانس نہیں۔"

سندری بہت سندر تھی۔ سنیل کی بیوی جسے ایک بار وہ گھر لے کر آیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ سندری جیسی بیوی پاکر بھی وہ اس کے خواب کیوں نہیں بھولا؟ کیا وہ بھول پائی ہے؟ رشتوں میں ایسا کچھ ہوتا ہے جو ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ بے پناہ دوریوں اور کڑواہٹ کے باوجود۔

بغل میں دابے ہوئے تکیے کو مہرو نے جدا کیا۔ جیسے وہ سنیل کو' صرف اسے ہی نہیں' اس کے خیال کو بھی الگ کر دینا چاہتی ہو۔ اور یہ آسان کام نہیں نہیں تھا۔ خاص طور سے رات کے سناٹے میں۔ اکیلے پن کے ساتھ۔ تب امّی کے گہرے خرّاٹے اور بار بار پہلو بدلنے کی چرمراہٹ بھی' دھیان نہیں ہٹا سکتی۔ اس نے بھی کروٹ بدلی۔ دوسری طرف پھر اکرم بھائی تھے۔ اس کے جسم اور روح کو جھنجھوڑتے ہوئے۔

اکرم بھائی سے وہ نمٹے گی۔ انھیں اپنی حرکت کے لئے نادم ہونا پڑے گا۔ اس نے طویل سانس بھری پھر بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ٹانگیں لمبی کیں۔ پھر سکوڑ کر گھٹنے پیٹ پر رکھ دیے تکیہ دوبارہ سینے میں بھینچ لیا۔ چھت پر بلّی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ جواب میں بلّے کے غرّانے کی۔ پھر دونوں کی گڈمڈ آوازیں۔ جو ایک خاص وقت کے لئے ہوتی تھیں۔

دور گھنٹہ گھر نے ڈیڑھ بجنے کا اعلان کیا۔ پھر صحن میں کسی کے قدموں کی آہٹ پھر ہلکی پھس پھساہٹ۔ "ہٹئے بھی، کوئی دیکھ لے گا۔"

"اس سنسان چاندنی رات میں؟"

"آپا جو ہیں، بلّی کی طرح جاگتی رہتی ہیں — رات بھر — میں نے محسوس کیا ہے۔"

"آپا بے چاری!" ایک آہ بھرنے کا عمل اور فلش کے چلنے کی آواز۔

"اے! کچھ دیر یوں ہی کھڑی رہونا...... ازار بند ہاتھوں میں تھامے۔ اس چاندنی رات میں وینس کی مورت کی طرح لگ رہی ہو۔ خدا کی قسم!"

"ہٹئے بھی۔ آپ بیماری میں بھی باز نہیں آتے۔"

اور پھر لوٹ پڑنے کی آہٹ۔ دم سادھے پڑی تھی وہ۔ کیا واقعی میں بلّی ہوں۔ کیا میں دانستہ بھائی بھاوج کی ٹوہ لیتی رہتی ہوں۔ صرف اس لئے کہ مجھے میرا حصل نہیں ملا؟ کوئی کس طرح کسی کی محرومی کے لئے اپنی رائے قائم کر سکتا ہے؟ اگر میں سچ مچ اپنے جسم کی آواز سننا چاہتی تو کوئی کمی تھی کیا؟ آج سے کئی برس پہلے فتّے خاں تو جیسے میرا دیوانہ ہو چکا تھا — اسی محلّے کا دادا۔ ساری اونچ نیچ کو برطرف کرتے ہوئے دیوار پھاند کر چلا آیا تھا اس رات۔ اس کے ہاتھ میں بیش قیمتی جڑاؤ ہار تھا۔ اپنی مہرو کے لئے۔ من ہوا اس کے چوڑے چکلے سینے میں دبکتی چلی جائے..... اپنے جسم کی آواز کا پیچھا کرتی ہوئی۔ فتّے خاں کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک خنجر کی طرح چیرتی ہوئی اس کے کلیجہ میں اترتی چلی گئی تھی۔ اور یکایک ابّو امّی کے چہرے — غم زدہ اور شرمندہ چہرے سوالیہ نشان کی طرح اس کے سامنے آئے۔

"— دفع ہو جاؤ اسی وقت، ورنہ شور مچا دوں گی۔"

فتّے خاں نے تذبذب سے دیکھا۔ تھوڑا آگے بڑھنے کو ہوا۔ پھر کوئی آہٹ پا کر دُم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ساری رات مہرو کے بدن میں کوئی کانٹا سا دوڑتا رہا۔ آج کی طرح نہیں تب سارا جسم تنور سا دہکتا تھا۔ اب تنور کسی قدر سرد پڑ چکا ہے۔ راکھ کی مٹمیلی پرت کے نیچے کچھ گنی چنی چنگاریاں — بس!

ایک یگ بیت گیا نوکری کرتے ہوئے۔ وہ وقت کاٹنے اور انتظار کرتے رہنے کا

ایک بہانہ تھا۔ کچھ مالی مفاد بھی۔ شروع میں دل میں ایک جوش تھا کہ وہ اپنے امّی ابّو پر بوجھ نہیں ہے۔ نہ بھائیوں پر۔ اچھا خاصہ بینک بیلنس ہو گیا تھا۔ اس امنگ کے ساتھ کہ اس کی شادی اس کی جمع پونجی سے ہو گی۔ بس، ایک عدد دولہے کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ، کیسے تھی؟ امّی ابّو کو اپنی کماؤ بیٹیا کے لئے کوئی معقول دولہا چاہئے ہوتا تو الطاف میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ الطاف جو اس کا کلیگ ہی نہ تھا، اور بھی بہت کچھ تھا۔ جیسا سنیل۔ نہیں سنیل نہیں۔ سنیل کی طرح۔ غریب ماں کا بیٹا تھا اور اس کا فیملی بیک گراؤنڈ ان کے شایانِ شان نہیں تھا۔ الطاف کا گھر میں آنا جانا تھا۔ سب اسے پسند بھی کرتے تھے۔ سیدھا، سچا، شریف ۔ مگر غریب۔ شاید اسے اپنی غریبی کا احساس تھا۔ شاید اسی لئے اس نے بیجا حرکت یا بیجا مانگ نہیں کی ہر دم سے ۔ تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے۔ جب تک تم قریب نہ آنے دو گی، نہ آؤں گا ۔ ایسا فرماں بردار شوہر پاکر زندگی سنور ہی تو جاتی!

اس ایک یگ میں کتنے افسر دیکھے! ایک دو کے سوا سب کے سب لمپٹ اور دل پھینک۔ اکیلی لڑکی کو سڑک پر ٹوٹی چونی سمجھنے والے۔ مس روزی کو یہ سب اچھا لگتا تھا۔ فلرٹ، خوشامدی اور ہانپتے ہوئے کتّے کی طرح زبان لٹکائے مردوں کی ٹانی اور جیب سے کھیلنا۔ اس نے ہمیشہ ایک دوری رکھی۔ شاید اس لئے کہ اس کی خاندانی تہذیب اس کے مانع تھی۔ شاید اس لئے کہ اب بھی اس کے دل میں ایک موہوم سی امید باقی تھی ۔ اپنے ہونے والے شوہر کو انمول، اچھوتا تحفہ سونپنے کی۔ مرد چاہے دنیا کے خزانے عورت کے قدموں میں ڈھیر کر دے، وہ سب عورت کی ایک باوفا مسکراہٹ اور اچھوتے خزانے کے آگے ہیچ ہے ایسا وہ تب سوچا کرتی تھی۔ آج ایسا نہیں سوچ سکتی، کیوں کہ غیر یقینی دھند میں اس کا وجود دھندلا اور بے معنیٰ ہو چکا ہے۔ کیا وہ بھی روشن آرا پھوپھی کی طرح کسی روز افواہوں کا بازار گرم کرے گی؟ خاندان کی ناک کٹوا کے رہے گی یا ریحانہ کی طرح کنوارے پیٹ کو چھپاتے پھرے گی یا کنویں باؤڑی میں ڈوب مرے گی؟ یہ سارے حالات بار بار اس کا منہ چڑاتے رہے ہیں۔ اگر کسی دن اپنے جسم کی آواز کی زد میں آ گئی تو ان میں سے کوئی بھی صورت اس کا جینا حرام کر سکتی ہے۔

بلّیوں کے لڑنے اور چیخنے کی آوازیں اب دور کسی چھت سے آ رہی تھیں۔
"مہرو! جاگ رہی ہو؟" امّی پانی پینے کے لئے اٹھی تھیں۔
"نہیں امّی، یوں ہی آنکھ کھل گئی۔" اس نے چادر سے منہ ڈھانپ لیا۔
اس کی توقع کے مطابق ہی سلیمان اور اس کی بیوی نے فجر کی نماز کے پہلے غسل کیا تھا۔ رات کی آہٹیں یاد ہو آئیں۔ ایک کسک کے ساتھ ــ آپا جو ہیں بلّی کی طرح جاگتی رہتی ہیں..... کیا میں بلّی ہوں؟ وہ بھاوج کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بھی کترا رہی تھیں جیسا کہ مشترکہ خاندان میں ہوتا ہے، ہر غسل اتارنے والی عورت کے ساتھ۔ لیکن اسے یہ پتہ نہیں ہوگا کہ مہرو آپا رات کے راز کی باتیں بھی جانتی ہیں، آج سے نہیں جب سے وہ اس گھر میں بیاہ کر آئی ہیں۔ لیکن کبھی بھاوج کو چھیڑا، کریدا نہیں، کیوں کہ اسے یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ بے ارادہ سنی گئیں راز کی باتیں ــ کتنا عجیب لگتا ہے جب کسی کے بارے میں ہم ایسا کچھ جانتے ہوں جو وہ نہیں جان سکتا کہ ہم نے جان لیا ہے!

ایک عام دن کی طرح ہی دن تھا وہ۔ بے مزا، بوریت بھرا۔ وہ ٹھیک وقت پر تیار ہو کر اپنے دفتر چلی گئی تھی۔ اس کے لئے وہ عام دن نہیں تھا۔ کیوں کہ اس کے پہلے اکرم بھائی کبھی اس کے ساتھ "نہیں ہوتے تھے۔ پتہ نہیں اس وقت اکرم بھائی کہاں ہوں گے؟ اگر اکرم بھائی اچانک راستے میں مل جائیں تو؟ کیا کرے گی وہ؟
بہت بار ہوتا ہے کہ ہم کسی کو یاد کرتے ہیں اور وہ سامنے ہوتا ہے۔
بس اسٹاپ پر اکرم بھائی جانے اسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔
"السلام علیکم!" پہلے توجہ مبذول کی گئی، پھر اسے کھینچنے کی کوشش۔ "کیسی ہو مہرالنساء" وینیٹی بیگ کو کس کر تھامے ہوئے اس نے جبڑے بھینچے۔ سرد آنکھوں سے ان کو گھورنے لگی....
"آپ یہاں؟ کیا میرا پیچھا کر رہے تھے؟" "آپ شریف گھر میں آنے کے لائق نہیں ہیں۔ ہٹئے، راستہ چھوڑ دیجئے۔"

ہونٹ کھلے نہیں۔
"میں تمہارے دفتر کی طرف ہی جا رہا ہوں۔ آؤ ڈراپ کر دوں۔"
وہ اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ گئی ۔ چپ چاپ۔
جب اسکوٹر ایک مہنگے ریسٹورینٹ کے سائبان میں رکا تب وہ چپ چاپ اتر بھی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کا دفتر نہیں ہے۔
"کیا لوگی ؟"
کولڈ کافی ! ..... جھناکے سے کرچیں کرچیں بکھر گئی۔
"جو آپ چاہیں۔"
"جو میں چاہوں ؟"
"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"
"میں رات کی حرکت کے لئے شرمندہ ہوں۔"
"ہونا بھی چاہیئے۔ آپ میرے ابّو کے پارٹنر ہیں۔"
"اب تمہارا بھی ہونا چاہتا ہوں۔"
"ابو کو خبر ہے ؟"
"نہیں، اس بات کی نہیں۔"
"تو کب آ رہے ہیں، سہرا باندھ کر۔"
"آج ہی اگر تم کہو۔"
نہرو کھلکھلا اٹھی۔ کھلے منہ پر ہتھیلی رکھتے ہوئے۔ یہ ادھیڑ عمر کا شخص جس کے کنپٹیوں پر سفید بال ہیں، جس کا پیٹ نکلا ہوا ہے، جس کے منہ سے تمباکو کی بو آتی ہے۔ میرا شوہر ہوگا۔ اس سے بڑا مذاق کیا ہوگا ؟ اکرم بھائی کے متعلق زیادہ نہیں جانتی۔ بیوی مر چکی ہے۔ ایک بیٹی رخسانہ ہے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہوئی۔ اور بیٹا اسلم خوبرو نوجوان۔ جو نہرو کو امی کہے گا ! کیسا لگے گا ؟
"تم ہنس رہی ہو !" اکرم بھائی کو ہنسی ناگوار گذری۔

" پتہ نہیں میں کس پہ ہنس رہی ہوں۔ اپنی قسمت پر؟ آپ کے مذاق پر؟ یا آگے کی زندگی پر؟"

" میں مذاق نہیں کر رہا۔ اگر تم چاہو۔ سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

" کبھی تھا۔ اب نہیں۔"

سنیل اور الطاف یکایک پاس کی کرسیوں سے اٹھ کر گویا اس کے مقابل آ کھڑے ہوئے۔

زرا دیر کے لئے اس کے سامنے دھند چھاگئی اور اس دھند میں اکرم بھائی کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو اٹھا۔

اکرم بھائی انجن کی طرح ناک اور منہ سے دھواں چھوڑ رہے تھے۔

" معاف کرنا۔ میں سگریٹ نہیں چھوڑ سکتا۔" کھسیاتے ہوئے بولے۔

" تب تو آپ سے میری نبھ نہیں سکتی۔" مہرو پھر کھلکھلائی۔ اسے راحت محسوس ہوئی۔ ایک نازک اور گمبھیر مسئلہ کو ہنسی اور دھوئیں میں گھلتے ہوئے وہ دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اکرم بھائی نے روکا نہیں۔ واقعی انھوں نے اس کے دفتر ڈراپ کر دیا اور سارے راستے خاموش رہے۔ انھوں نے سوچا کہ اپنی تجویز رکھنے میں انھوں نے بہت جلد بازی سے کام لیا۔ انھیں پہلے غور و فکر کر لینا چاہئے تھا۔ مہرو ایک کنواری لڑکی ہے خواہ اس کی عمر قدرے زیادہ ہو گئی ہے۔ لیکن ایک رنڈوے کے ساتھ بندھنے کے لئے وہ کبھی تیار نہیں ہوگی۔ پھر عمروں کا فاصلہ۔ اور اس فاصلہ سے بھی بڑھ کر دوسرا فاصلہ۔ ذات برادری کا۔ مہرالنسا، سیدزادی اور وہ خود ایک بھشتی۔ کون جانے، آج بھی ان کی بغلوں سے بزرگوں کی طرح مشک کی بو آ رہی ہوگی۔ باوجود عطر و سینٹ کے! کچھ چیزیں نسل در نسل چلی آتی ہیں۔ کبھی صاف کبھی دھندلی۔ اپنی جڑوں سے نجات نہیں ملتی۔ کتنا ہی ہوا میں اڑ لے کوئی! ــــ صابر صاحب ــــ مہرو کے ابا ہرگز تیار نہیں ہوں گے اس رشتے کے لئے۔ تب وہ کیا کریں؟ یوں ہی چوری چھپے اس پیاری لڑکی کے جسم سے کھیلنے کی کوشش کریں۔ جو ان کے حواس پر چھا گئی ہے اور جسے ذہن سے نکال پانا اب ناممکن ہے۔ یوں تو جسمانی ضرورتوں

کہیں بھی پوری کی جا سکتی ہیں لیکن ذہنی تسکین ! ان کی بقیہ زندگی کے خلا کو پُر کرنے کے لئے جہرو سے بہتر دوسری نہیں ہو سکتی۔ لیکن جہرو کے دل میں کیا ہے ؟ وہ کیوں چپ لگا گئی ؟ کیا ان سے کوئی بچکانہ حرکت سرزد ہو گئی ہے ؟

" آج تم اداس کیوں ہو ؟ " ہر ایک نے باری باری پوچھا گھر میں۔ اس شام اچانک بادل گھر آئے تھے۔ سیاہ۔ آندھی کے ساتھ ! پھر سب کچھ نگل لینے والا اندھیرا ' ہر سو پھیل گیا۔ وہ بھی بے موسم۔

" موسموں کا بھی بدن پر اثر ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے ؟ "

" طبیعت تو ٹھیک ہے نا جہرو ! کھوئی ہوئی کیوں ہو ؟ "

" میں ٹھیک ہوں ابّو..... مجھے کچھ نہیں ہوا امّی ! "

جب دن سادے ہوں ۔ اجلے اور صاف ۔ تب جہرو کو کچھ نہیں ہوتا۔ جب بادل امنڈنے گھمڑنے لگیں ' جب بجلیاں کڑکتی ہوں ' جب سردیاں چمکتی ہوں ' جب گھنی اداسی بھری دوپہریں ہوں ۔ تب جہرو ٹوٹ جاتی ہے۔ تب اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ تب اسے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی سازش کی شکار ہے۔ اس کی زندگی بے معنی و بیکار ہے۔ تمام اس کے دشمن ہیں۔ وہ رونے لگتی ہے۔ اندر ۔ گہرے میں۔ خشک آنکھوں سے۔

یوں ہی کب تک چلتا رہے گا ؟ کیا اب بھی کوئی آس باقی ہے ؟ کوئی شہزادہ اس کا منتظر ہے ؟ کتنے شہزادے ہیں اس کی قوم میں ؟ ایک بھی تو نہیں۔ الطاف اب ڈاکٹر ہے۔ تب غریب تھا۔ جب کوئی کچھ نہیں ہوتا اور ایک روز کچھ بن کر ہمارے سامنے آجائے تو ہماری کیا حالت ہوتی ہے ؟ کب تک حقیقت کو جھٹلائیں گے ؟ ابّو ۔ خاندانی عزّت ۔ کوئی معقول رشتہ !! رشتے کیا آسمانوں سے طے ہوتے ہیں ؟ کیوں مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی ؟ کیوں اپنے ہاتھوں بیٹی کا گلا گھونٹا ؟ مانا کہ آپ قوم کے مسیحا نہیں ہیں۔ آپ اکیلے سماج کو نہیں بدل سکتے لیکن جو آپ کے ہاتھ میں تھا۔ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنا..... وہ کیوں نہیں ہوا ؟ میں کیا کیا برداشت کروں ؟ اپنی بے معنی زندگی کو ؟ آپ کے جھوٹے وقار کو ؟ یا دنیا کے غلط سلط ارادوں کو ۔ بولئے ابّو ' کون ہے ان سب کا ذمہ دار ؟ سماج ؟ آپ ؟ یا میں خود ؟

ابّو ان سب باتوں سے بے خبر تھے۔ اکرم بھائی اب روز آنے لگے تھے۔ جہرو دانستہ ان سے دور رہنے لگی۔ لیکن یہ عجیب کرشمہ تھا کہ اس کی سوچ' اس کی چاہتیں اب اکرم بھائی کے ارد گرد منڈلانے لگی تھیں۔ اکرم بھائی کبھی کبھی باہر بھی ملتے۔ لیکن ریسٹورینٹ میں بیٹھنا۔ دوٹوک صاف باتیں کرنا پھر ممکن نہ ہوا۔ صرف علیک سلیک! یا "پھر کچھ سوچا؟" جواب میں سر جھکا کر گردن ہلا دینا۔ یہ جھوٹ ہوتا۔ سوچتی تو تھی وہ!

سوچنے سے ہی اسے لگا کہ چھتیس برسوں کی محرومی اور خلا کو پُر کرنے کے لئے اسے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ وہ تازندگی محرومی کا طوق اپنے گلے میں باندھے رکھنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ فجر کے وقت جب قرآنِ پاک کی تلاوت کرتی تو ان آیتوں پر ناگاہ اس کی نگاہ ٹھٹھک جاتی ..... ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں۔ زمین و آسمان۔ رات اور دن۔ مرد اور عورت ..... عورت اور مرد ایک دوسرے کے لباس ہیں۔ ہر شے دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ..... پھر دینی کتب کا مطالعہ۔ سنتِ رسولؐ کا ذکر۔ اور دنیاوی مثالیں۔ نورجہاں' ایلیزابیتھ ٹیلر۔ سعدیہ دہلوی۔ لیکن یہ سب تو بڑے نام ہیں۔ وہ ایک معمولی لڑکی ہے۔ مگر معمولی لڑکی کو بھی کبھی کبھی غیر معمولی فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ خصوصاً اس معاملے میں جہاں اس کی زندگی وابستہ ہے۔ آج تک ہر فیصلے کی گھڑی میں اس نے ابّو امّی کو دیکھا جو ہمیشہ اپنی عزت' آبرو اور وقار کو دیکھتے رہے ہے اور دیکھتے چلے جائیں گے ....." ہمیں جہرو کی بہت فکر ہے۔ بس اس کے ہاتھ پیلے ہو جائیں!"

امّی ابّو! آپ نے میری بہت فکر کر لی۔ اب تھوڑی فکر مجھے کر لینے دیجئے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے' کل آپ نہیں رہیں گے تو مجھے ہی تو اپنی فکر کرنی ہوگی ... آج کیوں نہیں؟ میرے وجود کے بھی کچھ معنی ہیں کہ نہیں؟ یہ سب سوچنے سمجھنے کے لئے آپ نے ہی تو مجھے قابل بنایا تھا؟ دنیا کی اونچ نیچ سمجھنے لائق ہوئی تبھی تو خود کو بچا پائی ... ہر مشکل گھڑی میں — اب نہیں —

امّی ابّو کے پلنگ پر بیٹھی ان کے گھٹنوں پر آیوڈکس مَل رہی تھیں۔ اس نے گلا

کھنکھارتے ہوئے کہا۔ "میں آ جاؤں اتی؟"

"آ مہرو۔ ہم تیری ہی باتیں کر رہے تھے۔ دیکھتا ہوں، کئی روز سے تو اداس، گم صم سی رہنے لگی ہے۔ کیا کسی نے کچھ کہہ دیا؟ دفتر میں سب ٹھیک ہے؟" ابّو تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔

مہرو پائینتی بیٹھ گئی سر جھکائے۔

"کیا بات ہے بیٹی؟" اتی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

مہرو نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ گلا بھرآیا ہوا۔ "میں کچھ مانگوں تو آپ انکار نہیں کریں گے نا؟"

"بول بیٹی۔ تیری خوشی کے لئے ہم کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ ہم سب کی خوشیاں تیرے ہی دم سے ہیں مہرو!"

"میں کچھ نہیں چاہتی.... آپ... آپ .... میری باقی زندگی مجھے سونپ دیجئے۔"

"تو کیا کہہ رہی ہے بیٹی؟ ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

"میں... تم... مجھے اکرم صاحب سے نکاح کرنے کی اجازت دے دیجئے پلیز!"

"اس بھشتی سے؟" یہ ابّو تھے۔

"اس ادھیڑ رنڈوے سے؟" اتی چیخیں۔

دونوں حیرت سے بُت بن گئے گویا بیٹی کے ایک جملے ــ بے خوف جملے نے انھیں پتھر کر دیا ہو۔ مہرو اٹھی اور اتی کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی۔

وہ فیصلے کی گھڑی تھی۔ لمحہ در لمحہ بوجھل پن کا احساس کراتی ہوئی۔ مہرو کا یہ روپ دونوں کے لئے نامانوس اور پرایا تھا ــ ان کے خواب و خیال کے برعکس!

* * *

(منی کہانیاں)

خلیل تنویر

آگ کا سفر

جب ہم چلے تھے ہمیں اپنی آگ کا احساس تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وقت گذرتا گیا۔ ہم نے آگ کو مقدس جان کر پوجنا شروع کر دیا اب آگ سے ہم ڈرنے لگے اور آگ ہمیں جلا کر راکھ کرتی رہی۔

نافہمی

تم نے اسے صلیب سے پہچاننے کی کوشش کی مگر تم اسے پہچان سکے؟ تم نے اسے صرف صلیب سمجھا۔

پہچان

تم سے میری پہچان' سارے رشتے اسی ایک شخص کے قریب آنے سے بنے۔ اور اب جب کہ وہ مجھ سے بہت دور چلا گیا ہے وقت نے تم سے میری پہچان بھی چھین لی ہے۔ اب میں تمہارے لئے اجنبی ہوں۔

سزا

ہر رات ہمیں ایک ریگستان میں بھٹکنا پڑتا ہے اور ہماری پیاس نہیں بجھتی۔ جانے کب یہ انت سفر ختم ہو؟ جانے یہ کون سی سزا ہے؟

کشتی کا سفر

کشتی سے اترتے ہوئے لوگوں کے چہروں کو خالی پن کا احساس بُری طرح جھلکتا ہے۔ آدم کی کہانی بھی تو کشتی کے سفر کی کہانی ہے۔ وہ جب بھی سناٹے کی حد پار کرتا ہے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ تم کسی اور ہی کشتی میں ہو۔ اس کے ہاتھ سے پتوار چھوٹنے لگتے ہیں۔ روشنیاں بجھنے لگتی ہیں۔

تمہارے بغیر

روشن اختر

گرمیوں کی اداس دوپہر ہے۔ کالج سے ابھی ابھی انویجیلیشن ڈیوٹی دے کر آئی ہوں ایک لڑکی ادھر آرہی تھی۔ مجھے بس کی قطار میں کھڑا دیکھ کر اسکوٹر روک لیا۔ میں نے بھی سوچا جلدی گھر پہنچ جاؤں گی۔ گھر آئی تو دیکھا تالا لٹک رہا ہے۔ میرا بھائی مجھے ہی لینے کالج گیا ہوگا۔ دل یوں بھی دکھ رہا ہے کہ وہ دھوپ میں سوکھ رہا ہوگا۔ ہو سکتا ہے لڑکیاں دیکھ رہا ہو

گڈو میاں گھر میں اکیلے سو رہے ہیں۔ اس لئے میں کہہ کر آئی تھی کہ بھیا تم مت آنا گڈو گھر میں اکیلا رہتا ہے تو میرا دل ڈرتا ہے۔ میں ٹھیک ۱۰ - ۲ پر وہاں سے روانہ ہوئی تھی پھر بھی بھائی گھر سے روانہ ہو چکا تھا۔ راستے میں بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ میں ۲۰ - ۲ پر گھر پہنچ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جاؤں۔ پھر تواس ٹھکانے آئے تو دھیان آیا گیرج والا کمرہ تو کھلا ہوگا۔ یہاں قلم بھی ہے اور کاغذ بھی، وقت کاٹ رہی ہوں۔ پونے تین ہو چکے ہیں، پیاس بہت لگ رہی ہے، بھوک تو کچھ خاص نہیں ستا رہی ہے پھر میں تو اپنے گھر کے ہی ایک حصے میں بیٹھی ہوئی، پنکھا بھی چل رہا ہے اور سر پر چھت بھی ہے۔ بائیں ہاتھ پر پارک کا خوبصورت منظر ہے مگر کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پھول کمہلائے ہوئے ہیں۔ پتوں پر پیلا پن ہے۔ ہائے اللہ کیا اداسی ہے۔ دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے کھٹکا ہوا اور جان نکل گئی۔ پھر دل کو سمجھاتی ہوں، شہر ہے جنگل تو نہیں۔ ہر طرف آبادی ہے۔ مگر اس آبادی میں بھی کتنی بھیڑ ہے۔

مجھے اپنا پیارا کتا یاد آتا ہے قریب سال بھر ہوا جب مر گیا۔ میرا کتا بڑا رفیق تھا جب کبھی میں اکیلی ہوتی تھی ہمیشہ آس پاس ہی منڈلایا کرتا تھا۔

کچھ دور سڑک پر ایک عورت پتھر توڑ رہی ہے۔ پاس ہی اس کا بچہ کھیل رہا ہے بڑی مطمئن نظر آرہی ہے۔ کیا اسے دھوپ نہیں ستا رہی ہے؟ کیا اسے پیاس نہیں لگ رہی ہے؟ یا اللہ! یہ کیسا اطمینان ہے؟ بے حس تو ہرگز نہیں ہے۔

سامنے اخبار پڑا ہے۔ سویرے اخبار والا ڈال گیا ہوگا؟

پہلی سرخی ـــ "میرٹھ میں فرقہ وارانہ فساد' کرفیو کا نفاذ"

دوسری سرخی ـ "پنجاب میں ۱۵ مرے"

تیسری سرخی ـــ "راجستھان میں گولی کانڈ۔"

میں گھبرا کر اخبار پھینک دیتی ہوں۔ سب لڑ لڑ کر مر جاؤ۔ ذلیل انسانوں اپنے رب سے بغاوت کرنے والوں تمہارے جینے سے فائدہ بھی کیا ہے۔ کہ تم نے کرۂ ارض کو فتنۂ وفساد سے بھر دیا ہے اور اس پر بھی اشرف المخلوقات کا تمغہ لگائے پھرتے ہو' شرم نہیں آتی اپنے کو خلیفۃ الارض کہتے ہوئے؟ لیکن مجھے یہ غصہ کیوں آرہا ہے؟ کس پر؟ خود اپنے آپ پر یا حالات پر؟ میں کچھ سمجھ نہیں پاتی ہوں۔

اپنے بھی کہتے ہیں ممی کو آج کل بہت غصہ آرہا ہے۔ ہاں بھئی رہتا تو ہے۔ سچی بات ہے۔ پھر بھی جب میں بچوں کے منھ سے یہ سب سنتی ہوں تو انھیں پر غصہ کرتی ہوں۔ آج کالج میں بھی لڑ جھگڑ کر آئی ہوں۔ اس وقت تو ساری غلطی امیش کی لگ رہی تھی لیکن اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے میں نے ہی زیادتی کی۔ وہ غریب تو فوراً ہی "سوری سوری" کہنے لگا تھا۔ سچ سچ میں بڑی جھگڑالو ہو گئی ہوں' بس اب تم جلدی سے آجاؤ' دیکھو دیر نہ کرنا ورنہ میں اسی طرح شہر بھر سے' دنیا بھر سے لڑتی جھگڑتی رہوں گی پانچ سال کوئی معمولی مدت تو نہیں ہوتی۔ جب سے تم نے بن باس لے رکھا ہے اور میں تنہا اس بھری پری دنیا میں جئے جا رہی ہوں۔ ایسی زندگی جس کا کوئی مقصد ہی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ پتہ نہیں تمہیں کیسا لگتا ہوگا۔ تم تو اجنبی لوگوں میں ہو اجنبی

سرزمین میں سے؟ مجھے تو ہر لمحہ ایک سال جیسا لگتا ہے۔ میں ایسی چڑچڑی اور جھگڑالو تو نہیں تھی۔ یہ سب تو اس لئے ہو رہا ہے تم جو نہیں ہو......

مراجعت

رئیس احمد عثمانی

ندیم نے پھر ایک اچٹتی ہوئی نظر مقابل سیٹ پر بیٹھی لڑکی کے اداس چہرے پر ڈالی۔ ندیم اور وہ اجنبی لڑکی دونوں ہی سلام پور کے ریلوے اسٹیشن سے دارالحکومت جانے والی اس ٹرین میں چڑھے تھے۔ ۳۱ر دسمبر کی یہ طویل شب اپنا آدھے سے کچھ زیادہ سفر طے کر چکی تھی۔ نئے سال کی آمد سے بے خبر دوسرے درجہ کے مسافر گہری نیند میں مدہوش تھے۔ ڈبے میں صرف ندیم اور وہ اجنبی لڑکی ہی جاگ رہے تھے۔

کسی گہری سوچ میں مبتلا اجنبی لڑکی کے اداس چہرے پر بار بار کرب کے آثار ابھر آتے۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھیں اس کے پوشیدہ غم کو عیاں کر رہی تھیں۔

......" نہ جانے بے چاری کو کیا دکھ کیا غم ہے ؟" ندیم پشت گاہ سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔

" دنیا میں آج کون ایسا ہے جو غم سے خالی ہو۔ خود اس کی زندگی بہت سے غموں سے بھری ہوئی تھی۔ ایک طرف مستقل روزگار نہ ملنے کا دکھ تھا تو دوسری طرف اس کی ازدواجی زندگی بھی خوشحال نہ تھی۔"

اچانک، ہچکیوں کے ساتھ رونے کی آواز سے ندیم کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھی اجنبی لڑکی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اس کے رونے کی آواز بہت دھیمی تھی اسی لئے کسی

مسافر کے جاگ جانے کا امکان نہ تھا۔ ندیم خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

" کیا بات ہے محترمہ ؟ "

وہ ندیم کی آواز سُن کر ہڑبڑائی اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے ندیم کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

" کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں ؟ " ندیم نے پھر پوچھا۔

" جی نہیں " اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ " میری کچھ ذاتی پریشانیاں ہیں "۔

" میرا خیال ہے ذاتی پریشانیاں ایسے لوگوں سے چھپائی جاتی ہیں جن سے کوئی تعلق ہو، کچھ تعارف ہو۔ ہم ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہیں اور محض کچھ دور تک ہم سفر ہیں۔ پھر یہ بھی سنا ہے کہ کہہ دینے سے غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے میں آپ کو کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔ "

" شاید اب مشورہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ " اجنبی لڑکی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

" لفظ شاید سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی ہی بات کا پختہ یقین نہیں لیکن آپ بتانا نہیں چاہتیں تو آپ کی مرضی۔ میں تو اس لئے زور دے رہا تھا کہ میں خود ایک دردمند انسان ہوں اور ایک دردمند انسان ہی دوسرے کے درد کو سمجھ سکتا ہے۔ کچھ آپ کا غم سنتا کچھ اپنا درد بیان کرتا تو دل کچھ ہلکا ہو جاتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ " ندیم کا لہجہ افسردہ تھا۔

" میری پریشانی ذاتی اور گھریلو ہے سوچتی ہوں آپ کو بتا کر کیوں پریشان کروں۔ " لڑکی نے وضاحت کی۔

" میرے حصہ میں تو پہلے ہی غم کا سمندر ہے۔ اس میں کچھ اور بڑھ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ "

" لگتا ہے آپ مجھ سے زیادہ غم زدہ ہیں پھر بھی اپنے درد کو آپ کس طرح چھپائے ہوئے ہیں ! مجھے حیرت ہے۔ "

" لاوے کو اپنے اندر چھپائے رکھنے کا درد آتش فشاں ہی جانتا ہے۔ "

" بہتر ہو گا کہ پہلے آپ اپنی آپ بیتی سنائیں تب تک میں بھی خود میں اپنا غم بیان

کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکوں گی۔" لڑکی نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے۔" ندیم نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

"میری شریکِ حیات صبا معمولی ناک نقش، سانولے رنگ والی کم پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ شادی سے قبل میں اپنی شریکِ سفر کو حسن کی دیوی تصور کرتا تھا........ جب صبا میرے خوابوں کی کسوٹی پر کھری نہ اتری تو میرا دل بجھ سا گیا اور میں کبھی اسے ٹوٹ کر پیار نہ کر سکا...... اس کی دوسری وجہ شاید یہ بھی کہ صبا نے بھی کبھی مجھ سے پیار کا اظہار نہ کیا تھا" ندیم کچھ دیر سانس لینے کے لئے رکا۔ "میں گریجویٹ ہوں، ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتا ہوں، اور فرم کی روز بہ روز بڑھتی زیادتیوں کا شکار ہوں۔ اپنی باہری دنیا کی پریشانیاں لے کر جب میں گھریلو زندگی میں قدم رکھتا تو صبا اپنے دن بھر کے معاملے اور شکوہ شکایت لے بیٹھتی۔ میں ڈانٹتا اور وہ برہم ہو جاتی۔ اس نے کبھی میری پریشانیوں کو سمجھنے کی قطعی کوشش نہیں کی۔ پر روز کے ان جھگڑوں سے مجھے زندگی تلخ محسوس ہونے لگی۔ مجبوراً مجھے صبا کو اس کے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑا.........

"ابھی میں صبا کو اس کے گھر سلام پور چھوڑ کر لوٹ رہا ہوں...... اور اسے ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی سے نکال دینے کے فیصلہ پر غور کر رہا ہوں...... میں اپنے اس فیصلہ کو شاید جذباتی طور پر یک لخت عمل میں لے آتا....... لیکن میرے دو سالہ معصوم بچے عبید کی قلقاریاں مجھے روک رہی ہیں۔" ندیم کا لہجہ بھاری اور سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

اجنبی لڑکی نے اپنی نم ہوگئی آنکھوں کو رومال سے خشک کیا۔ "آپ کی کہانی نے میرے زخموں کو کرید دیا ہے..... میں ایک عورت ہوں اسی لئے ایک عورت کے جذبات کو ٹھیک طرح سمجھ سکتی ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ صبا کے خوبصورت نہ ہونے میں اس کا اپنا کیا قصور تھا۔؟"

"نہیں..... اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں۔ لیکن مجھے صبا کے خوبصورت نہ ہونے کا اتنا دکھ نہیں جتنا اس کے بااخلاق نہ ہونے کا احساس ہے۔" ندیم نے جواب دیا۔

"معاف کیجئے گا جناب، لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" ندیم نے تردید کی۔

"اچھا!" لڑکی کا لہجہ طنزیہ تھا۔ "آپ ہی نے ابھی کہا کہ صبا کم پڑھی لکھی لڑکی ہے اور آپ ایک پڑھے لکھے گریجویٹ۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ لڑکی اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر ایک اجنبی ماحول، انجان لوگوں اور نئے گھر میں قدم رکھتی ہے تو وہ کیا محسوس کرتی ہے؟.... وہ اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہاں کوئی اس کا اپنا ہو، جو اس کے جذبات کو سمجھ سکے...... جب لڑکی کے ماحول سے مختلف کوئی نئی بات وہاں ہوتی ہے تو وہ شوہر کو اپنا سمجھ کر اسے وہ باتیں بتانا چاہتی ہے، شوہر سے وہ امید کرتی ہے کہ وہ اس کی بات سنے گا اور اس کی مدد کرے گا..... ایسے میں شوہر کا فرض ہوتا ہے کہ وہ تسلی سے بیوی کی بات سنے اور اسے صبر سے کام لینے کی تلقین کرے تاکہ دھیرے دھیرے لڑکی کو نئے ماحول کو سمجھنے اور اس میں ڈھلنے کا موقع فراہم ہو.....لیکن شوہر؟ بیوی کی اس فطری شکایت کو اپنے گھر کی بنیادیں ہلانے کی کوشش سمجھتا ہے..... کیا کبھی آپ نے اپنی بیوی کو سمجھنے اور اسے سمجھانے کی کوشش کی؟"

ندیم خاموش رہا۔ لڑکی نے پھر کہنا شروع کیا۔

"جب آپ پڑھے لکھے ہو کر اپنی بیوی کے جذبات کو نہ سمجھ سکے تو ایک کم پڑھی لکھی سے لڑکی سے ایسی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔؟...... میں سمجھتی ہوں کہ آپ نے اختصار سے کام لیتے ہوئے کہہ دیا کہ آپ اپنی بیوی کے شکوے شکایت پر اسے ڈانٹتے اور وہ برہم ہو جاتی۔" لڑکی کی آواز بھاری ہو چلی۔

حقیقت یہ ہوگی کہ اس کی شکایتیں سن کر آپ بھوکے شیر کی مانند اس پر ٹوٹ پڑے ہوں گے اور آپ نے لاتوں گھونسوں سے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہوگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دونوں کے بیچ گہری کھائی پیدا ہو گئی اور آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرد کو دئے گئے حق کو ہتھیار بنا کر اپنی بیوی کی زندگی سے برباد کر دینے پر غور کرنے لگے..... لیکن آپ کو اس سے کیا سروکار کہ اس کی زندگی برباد ہوتی ہے۔ یا پائمال۔ آپ تو اپنے شرعی حق کو سینہ تان

کر استعمال کر سکیں گے اور بے چاری لڑکی اُف بھی نہ کر سکے گی۔" اجنبی لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بہتے آنسوؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسلسل اپنی بات کہتی رہی۔

ندیم نے دل ہی دل میں قبول کیا کہ اس کا کہا ایک ایک حرف صحیح تھا۔ ندیم کو حیرت تھی کہ وہ اجنبی لڑکی اس کی زندگی کی پوشیدہ سچائیوں سے کیسے واقف ہو گئی۔ اسے ماننا پڑا کہ اپنے تمام مسئلوں کو اس نے کبھی اس زاویہ سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی صبا کے نقطۂ نظر سے اس پر غور کیا تھا۔ اسے اپنی بھول کا احساس ہونے لگا

ندیم نے دیکھا کہ اجنبی لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"معاف کیجئے گا محترمہ' میری باتوں سے آپ کو تکلیف پہنچی۔" ندیم نے شرمندہ لہجہ میں روتی ہوئی لڑکی سے کہا۔ لڑکی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

"جی ہاں' آپ کی کہانی سے میرے دل کے زخم ہرے ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ میں خود اپنے شوہر کے ایسے ہی مظالم کا بارہا نشانہ بنی ہوں۔"

"کیا؟" ندیم چونک اٹھا۔

اجنبی لڑکی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"میں ایم۔ اے۔ پاس ہوں لیکن ایک غریب خاندان سے متعلق ہونے کے سبب میرے ماں باپ نے ایک دولت مند آدمی کے ساتھ میرا بیاہ کر دیا۔ میرے شوہر بالکل سے جاہل اور بدصورت انسان ہیں لیکن مجھ سے بہت خوش رہتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کے برتاؤ میں فرق آنے لگا۔ وہ میری آزادی' میرے ملنے جلنے پر پابندی لگانے لگے۔ دراصل انھیں شک تھا کہ میرے ایک رشتے کے بھائی' جو سلام پور میں ہی ملازم ہیں' کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔ میں یہ جھوٹا اور گھناؤنا الزام برداشت نہ کر سکی اور میں نے ان کی مخالفت کے باوجود اپنے بھائی سے ملنا جلنا جاری رکھا........ جس کا جواب........ انھوں نے اپنی وحشیانہ خصلت سے دیا۔ میں یہ ظلم سہہ کر بھی ان کے گھر میں رہتی رہی لیکن اب پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے........ وہ اکثر رات شراب پی کر دیر سے گھر آتے ہیں اور پھر...... جو دل میں آتا ہے کہتے ہیں۔..... کرتے ہیں..... مجھ پر فحش سے الزام

لگاتے ہیں۔ میرے سسرال میں میرے شوہر کے سوا سگا کوئی نہیں جو میری مدد کرے
...... مجھے تسلی دے یا جس سے کہہ کر میں اپنا غم ہلکا کر سکوں۔ آج رات بھی جب وہی
روز کی کہانی دہرائی گئی تو میں برداشت نہ کر سکی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے شوہر کو چھوڑ
آئی۔ میں ایک پڑھی لکھی عورت ہوں کوئی کام یا نوکری کر کے اپنا پیٹ پال لوں گی۔" وہ
اپنے آپ کو سنبھالتے سنبھالتے بھی ایک بار رو پڑی۔

ندیم کو حقیقتاً اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ ایک قابلِ رحم عورت تھی۔

"مجھے بے حد افسوس ہے محترمہ .... لیکن اگر غور و فکر کیا جائے تو اس معاملے
میں چاہے زیادہ خطاوار آپ کے شوہر ہوں لیکن کچھ غلطیاں انجانے میں آپ سے بھی
سرزد ہوئی ہیں جنھوں نے آپ کی کہانی کو دردناک موڑ بخشا ہے۔ دراصل آپ سے بھی اپنے
شوہر کے احساسات کو نہ سمجھ پانے کی بھول ہوئی ہے .... میں مرد ہونے کے ناتے
آپ کے شوہر کے احساسات کی شاید کچھ ترجمانی کر سکوں .... آپ کے شوہر ابتدا میں
آپ پر جان نثار کرتے تھے' اس کا مطلب ہے کہ وہ آپ جیسی خوبصورت اور تعلیم یافتہ بیوی
پا کر خوش تھے۔ لیکن جب آپ کے گھر آپ کے رشتے کے بھائی' جو یقیناً تعلیم یافتہ اور آپ کے شوہر
کے مقابلے میں حسین ہوں گے' مسلسل آنے لگے تو آپ کے شوہر میں اپنی کمیوں کا احساس
جاگا اور وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر آپ کے بھائی کو اپنا رقیب سمجھنے اور اس سے حسد
کرنے لگے ہوں گے .... آپ ان کے جذبات کو نہ سمجھ سکیں' کوئی بات نہیں .... لیکن
جس دن انھوں نے پہلی مرتبہ اپنے شک کا اظہار آپ پر الزام لگا کر کیا تھا' آپ کو عقلمندی
سے کام لیتے ہوئے اپنی ازدواجی زندگی کی خوشحالی کے لئے چاہئے تھا کہ اپنے بھائی سے
میل جول روک دیتیں ..... لیکن آپ نے اسے اپنی عزت کا سوال بنا کر اپنے شوہر کی
مخالفت کی اور ان کی مرضی کے خلاف اپنے بھائی سے ملتی رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ آپ کے
شوہر کا شک یقین کی حد کو پہنچا ہوگا اور وہ آپ سے دور ہٹتے چلے گئے ہوں گے .... جس
طرح عورت اپنے شوہر پر اپنا حق سمجھتی ہے اسی طرح مرد بھی بیوی کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہے
اور چاہتا ہے کہ اس کی بیوی کی مسکراہٹ صرف اس کے لئے ہی ہو۔ جو لوگ اپنی بیوی سے

بے انتہا پیار کرتے ہیں آپ کے جیسے معاملے میں ان ہی لوگوں میں جلن و حسد کا جذبہ جلدی پیدا ہوتا ہے .... لیکن آپ ان کے پیار کو نفرت مان بیٹھیں اور وہ آپ کے غم میں شراب میں ڈوبتے چلے گئے ...... میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ آج بھی آپ سے بے حد پیار کرتے ہیں اور آپ کی جدائی ان کی تباہی کا سبب ہوگی۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں" لڑکی نے کھوئے لہجہ میں جواب دیا اور سوچنے لگی کہ اس نے اپنے معاملے میں اس نظریہ سے غور کیوں نہیں کیا تھا۔ وہ حقیقتاً اپنے شوہر کو غلط سمجھ رہی تھی۔ اس نے تصویر کا صرف ایک ہی رُخ دیکھ کر فیصلہ کرنے کی بھول کی تھی۔

"ایسا لگتا ہے کہ اپنے اپنے طور پر ہم دونوں ہی کم خطاوار نہیں .... اللہ نے شاید یہی احساس دلانے کے لئے ہم دونوں کو یکجا کیا ہے۔" ندیم کے لہجے سے پچھتاوے کا احساس عیاں تھا۔ لڑکی خاموش رہی۔ ندیم نے پھر کہنا شروع کیا۔

"اب جب ہم میں احساسِ خطا جاگ اٹھا ہے تو وقت رہتے ہمیں سنبھل جانا چاہئے"

"میں سمجھی نہیں۔" لڑکی نے لب کشائی کی۔

"ہم دونوں نے ابھی واپسی کی راہ نہیں کھوئی ہے ہمیں واپس جاکر فراخ دلی سے اپنی غلطیوں کا ازالہ کر لینا چاہئے اور پھر تا زندگی ایسی کوتاہی نہ ہو' اس کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔" ندیم نے مشورہ دیا۔

"میں آپ کے خیال سے متفق ہوں۔" لڑکی نے نیچی نظریں کئے دبے لہجہ میں ندیم کی تائید کی۔

ٹرین اپنی رفتار سے دوڑی جارہی تھی۔!!

———— ٭٭٭ ————

تلخ حقیقت

شانتا بالی

نجمہ اپنی سفید ساڑی کا پلّو تھوڑا سا اوپر اٹھائے ہال کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اس ہال میں ایک آدمی کی جانب سے چند ادیبوں کو ان کی ادبی خدمات کے لئے ایوارڈ دئے جانے تھے۔ وہ ہولے ہولے قدم بڑھاتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی اور اپنے چشمے کو درست کرتے ہوئے اس نے سامعین کا جائزہ لیا ...... زیادہ تو چہرے اس کے پہچانے ہوئے تھے لیکن ایسا ایک بھی چہرہ نہیں تھا جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ وہ پیچھے کی کرسی پر چپ چاپ جاکر بیٹھ گئی۔

اسٹیج پر اکادمی کے سکریٹری صاحب سالانہ رپورٹ پڑھ رہے تھے۔ وہیں رکھی کرسیوں پر جناب صدر، مہمانِ خصوصی اکادمی کے چیرمین اور ایوارڈ لینے والے دو ادیب بیٹھے تھے۔ ایک کرسی خالی پڑی تھی جو غالباً اس کے لئے رکھی گئی تھی کیوں کہ آج ایوارڈ پانے والوں کی لسٹ میں اس کا بھی نام تھا۔ کرسی پر آرام سے بیٹھے ہوئے اس نے دو ایک لمبی سانسیں لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ کل صبح تک تو اس کی ایسی حالت نہ تھی لیکن شام کی ڈاک سے ملے دونوں بچوں کے خطوط اس کی دماغی برہمی کا سبب بن گئے۔ آج جب یہاں آنے سے پہلے جب اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو اسے لگا جیسے کل والی نجمہ سے آج کی نجمہ دس سال بوڑھی ہو چکی ہے۔ اس کے چہرے کی جھریاں کافی نمایاں تھیں۔

سیکریٹری صاحب رپورٹ پڑھ چکے تھے اور اب چیئرمین صاحب ایوارڈ پانے والے ادیبوں کا تعارف کرا رہے تھے۔ وہ ان کی ادبی خدمات کا اختصار کے ساتھ حوالے دیتے ہوئے ان کی نگارشات اور اسلوب پر روشنی ڈال رہے تھے۔ نجمہ گو ظاہرا طور پر وہاں موجود تھیں لیکن اس کی دماغی کیفیت کہیں اور ماضی کی یادوں میں لے گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بہت پرانی تصویر نمایاں تھی جس میں ایک سات سال کی چھوٹی سی بچی ہاتھ میں اسکول سے ملے انعام جو کہ بہترین گانے کے لئے ملا تھا' اٹھائے بنگلے کے لان میں جمع شدہ شہر کے معزز لوگوں کے بیچ کھڑی تھی۔ اس کے والد جو شہر کے ایس۔پی۔ تھے اس کا تعارف موجود معززین سے کرا رہے تھے۔ اسے یاد آرہا تھا کہ اس کے والد کے چہرے پر جو خوشی اس وقت دکھائی دے رہی تھی اس نے اس کے سامنے ان کی شخصیت کا ایک چھپا ہوا پہلو اجاگر کیا تھا ورنہ ان کی امیج ایک بارعب اور سخت پولیس افسر کی تھی جو اپنے گھر میں بھی پولیس آفیسر جیسا ہی تھا۔ آج کی پارٹی کا اہتمام اس لئے کیا گیا تھا کہ اپنے دوستوں کے سامنے اپنی بچی کی مخفی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بڑے بھائی حامد نے ہارمونیم کو دونوں ہاتھوں سے پیانو کی طرح بجانا شروع کیا اور وہ لہک لہک کر گانے لگی۔ گانا ختم ہوتے ہی اس کے والد نے گود میں اٹھا کر چوما جو کہ اس کی زندگی ایک حسین تجربہ بن گئی۔

چیئرمین صاحب اس وقت اس کی ادبی کاوشوں پر روشنی ڈالنے لگے تھے۔ ان کی آواز اسے دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمیں اس ادیبہ پر ناز ہے اس کے افسانے ہمیشہ ہمارے آپ کے آس پاس کے کرداروں کو لے کر ہی بنے گئے ہیں۔ یہ اپنی بات بے باکی سے کہتی ہیں۔ افسانہ پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ مرکزی کردار کو انھوں نے خود جیا ہے۔ ہمارے کچھ نقاد صاحبان کو ان کی بے باکی اور زبان پر اعتراض ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ دونوں حقائق ان کے لئے اوصاف اور ان کی پہچان بن گئے ہیں۔

وہ پھر اپنے ماضی میں گم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب ایک اور تصویر آگئی تھی جس میں اس کی بچی ڈبیٹ میں ملے پہلے انعام کو لئے گھر آئی تھی۔ وہ اور اس کے شوہر

کس قدر خوش تھے کہ انھوں نے اس انعام کو دیوان خانے کے شوکیس میں نمایاں مقام پر رکھا تھا اور جب بھی کوئی شخص اس کے بارے میں پوچھتا تو دونوں خوشی سے پھول کو کہتے تھے کہ یہ ہماری بچی کو ملا ہے اور پھر خاص طور سے بچی کو اندر سے بلا کر اس کا مہمانوں سے تعارف کرایا جاتا تھا۔

اپنے پرس میں سے رومال نکال کر اپنی نمناک آنکھوں کو پونچھا، چشمے کو صاف کیا اور آنکھوں پر لگا لیا۔ چیئرمین صاحب فرما رہے تھے "اب میں آج کے مہمانِ خصوصی جناب .... سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے دستِ مبارک سے ادباء کو انعامات تقسیم فرمائیں، مجھے بے حد افسوس ہے کہ محترمہ نجمہ صاحبہ آج یہاں کسی وجہ سے تشریف نہیں لا سکیں اس لئے میں چاہوں گا کہ اگر ان کے صاحب زادے یہاں موجود ہیں تو اپنی والدہ کا انعام حاصل کریں۔

اس کے ضبط کا باندھ اب ٹوٹ چکا تھا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے اور وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر بہ مشکل اسٹیج کی جانب بڑھنے لگیں۔ لگ رہا تھا کہ اگر اسے سہارا نہ دیا گیا تو وہ لڑکھڑا کر گر پڑے گی۔

چیئرمین صاحب فرما رہے تھے۔ "مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے بے حد خوشی ہے کہ محترمہ نجمہ صاحبہ تشریف لے آئی ہیں۔" سامعین میں سے متعدد لوگوں نے اسے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آیا سیلاب اسے ہال کا منظر دیکھنے میں دقت پیش کر رہا تھا۔ مگر ماضی کی ریل اب اسے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بچے پرویز کو گولڈ میڈل ملا تھا اور وہ مبارک دینے والے احباب کو مٹھائی کھلا رہی تھی حالانکہ اس کی دل کی کیفیت مضمحل اور منتشر تھی مگر اس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ چسپاں کر رکھی تھی۔ اس کے خاوند انتقال فرما چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس خوشی کے موقع پر باطن میں کچھ اور بھی ٹوٹ چکی تھی۔ رات کو جب گھر کے سب لوگ سو گئے تھے تو اس نے اپنے خاوند کی تصویر کے سامنے وہ گولڈ میڈل رکھتے ہوئے کہا تھا۔ "دیکھو میں نے تمہارے خواب کی تعبیر پوری کر دی ہے اور ایک ہی پہئے کی گاڑی منزل تک لے آئی ہوں مگر اب میں بہت تھک گئی ہوں

"محترمہ آپ اجازت دیں تو میں سہارا دوں" یہ آواز راشد کی تھی جو اس کے بچپن کا دوست تھا۔ اس کے ساتھ اس نے مٹی کے گھروندے بنائے تھے۔ آنکھ مچولی کھیلی تھی اور ہاتھ سے آم چھین چھین کر کھائے تھے لیکن جو کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر چلا گیا تھا اور پھر طویل عرصہ تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی اور ہوئی بھی تو تب جب اس کے خاوند کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ ماتم پرسی کے لئے آیا۔ اسے یاد ہے راشد نے کہا تھا "نجمہ میں تمہارا بچپن کا دوست ہوں۔ کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ میرے دوستی کے لئے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھامنا پسند کرو گی؟"

بے باک افسانے لکھنے والی نجمہ میں اپنے معاشرے اور سماج سے بغاوت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لئے راشد کو اپنے سوال کا کوئی جواب نہ مل سکا لیکن آج اس نے بلا حیل و حجت وہ ہاتھ تھام لیا۔

راشد کے ایک ہاتھ میں گلدستہ اور انعام تھا۔ دوسرے سے وہ اسے سہارا دئے ہوئے گاڑی تک لایا اور سامنے والا دروازہ کھولتے ہوئے اسے سیٹ پر بیٹھنے کو کہا اور خود ڈرائیو کرنے لگا۔

نجمہ نے اپنی گردن سیٹ پر ٹیک دی اور بہت ہی ٹوٹے لہجے میں بولی "راشد ہم جن بچوں کی چھوٹی سے چھوٹی خوشی کو زندگی کا سرمایہ سمجھتے ہیں ان کے پاس ہماری کسی خوشی کو بانٹنے کا وقت نہیں ہوتا۔ جانتے ہو میرے بیٹے اور بیٹی کا ایک رسمی مبارکباد کا کارڈ آیا ہے اور انھوں نے دو سطروں میں ہی نہ آسکنے کی مجبوری کا اظہار کیا"

"نجمہ تمہیں تو آج خوش ہونا چاہئے۔ چھوڑو ان باتوں کو۔"

"راشد ہم اپنے بچوں کے کئے کیا کچھ نہیں کر سکتے اور وہ ......"

اس کے بعد اس کا گلا بھر آیا اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ گاڑی اس کے گھر آکر رک گئی تھی۔ مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ اس نے کچھ پودوں کو کافی اونچائی پہ لٹکایا ہوا تھا جنہیں دیکھ کر وہ بولی۔ "مالی جی یہ پودے سوکھ رہے ہیں"۔ "مالکن جب تک آپ مشین نہیں لگوائیں گے ان تک پانی نہیں پہنچ سکتا۔ نیچے بہنے کو تو پانی کو کوئی تکلیف نہیں لیکن اوپر

چڑھانے کے لئے زور لگانا پڑتا ہے۔"

دیوان خانے میں داخل ہوتے ہی راشد نے شوکیس میں انعام کو سجا دیا۔ اپنے آپ کو کرسی پر گراتے ہوئے نجمہ بولی۔ " راشد اس سے پرویز کی ٹرافی چھپ جائے گی۔ اسے پیچھے رکھو۔ راشد کے چہرے پہ طنزیہ مسکراہٹ نمایاں تھی۔ اس نے اٹھ کر ٹرافی آگے رکھ دی اور کہا۔" تمہارے سوال کا جواب میں نے تو نہیں دیا لیکن مالی نے دے دیا" نجمہ نے حیرانی سے پوچھا کہ کون سا سوال اور کیسا جواب؟

" اس نے کہا تھا نہ کہ پانی نیچے کی طرف ہی بہتا ہے۔ اوپر چڑھانے کے لئے زور لگانا ہوتا ہے۔ ہمارے ماں باپ نے ہمیں پیار دیا۔ ہم نے اپنے بچوں کو اور وہ اب اپنے بچوں کو دیں گے۔ الٹا کرنے کے لئے فرض کے احساس کی مشین لگانی پڑتی ہے۔ اچھا اب میں چلوں۔ خدا حافظ!"

وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے تک اسے الوداع کہنے آئی اور بولی۔" راشد کبھی کبھی آتے رہنا۔"

کالی زمین

شاہد عزیز

موت کی گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے مجھے محسوس ہونے لگا کہ اب ان بادلوں سے پانی، اس کالی زمین پر برس جائے گا اور پھر وہاں انسان پیدا ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر میں موت کی گھاٹیوں سے نیچے اتر آیا۔ اور پھر زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں چلنے لگا مگر اپنی پیاس بجھانے کے لئے مجھے ابھی تک کوئی سمندر نہیں ملا۔

پانی بادلوں میں ہی کہیں سوکھ گیا۔ اس شہر میں کوئی انسان پیدا نہیں ہوا۔ سرحد کی کالی زمین ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئی۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں اپنے لباس کے باوجود ننگا ہوں۔ میں اپنے لباس کے باوجود ننگا کیوں ہوں؟ اب تک میں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے سے قاصر ہوں۔ "مرتے ہوئے شہر کے بارے میں سوچنا فضول ہے اپنے جذبات، اپنے احساس، اپنی سوچ سب کو مرتے ہوئے شہر کے ساتھ مر جانے دے۔" یہ آواز میرے اندر سے آرہی تھی۔

جب میں گھاٹی سے نیچے اتر رہا تھا تو سامنے پھیلے ہوئے ایک کھیت میں ایک عورت اُگ رہی دھان کی بالیوں سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ میرا پہلا اتفاق تھا کہ میں ایک زندگی کو اس طرح خوش دیکھ رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں اس عورت سے بات کروں۔ اس سے اس کے بارے میں پوچھوں۔ اس سے یہ بھی پوچھوں کہ یہ فصل کب تک پک کر تیار ہو جائے گی۔ فصل کے پک کر تیار ہونے کا خیال آتے ہی میرے سامنے بھوک سے دم توڑتا ہوا شہر کسی

سمندر میں ڈوبتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

پھر خیال آیا' انتظار ضروری ہے۔ ہر چیز کو پانے کے لئے کچھ انتظار لازم ہے۔ مگر کب تک ؟ انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میں آج تک اسی انتظار میں تھا کہ کالی زمین پھر سے ہری ہو جائے گی۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کالی زمین ٹکڑوں میں بٹ گئی اب کسی بادل کا پانی اس پر نہیں برسے گا۔ میں ہمیشہ پیاسا ہی رہوں گا۔

وہ عورت اپنے کھیت سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کھیت سے توڑی ہوئی تازہ بالیاں تھیں۔ شاید اب کھانا بنانے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ گھر جا کر کھانا بنائے گی۔ میری بھوک برداشت سے باہر ہو گئی۔ دل میں خواہش ہوئی کہ وہ مجھے گھر چلنے کو کہے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم دونوں ایک ہی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ ہم بہت دیر تک یوں ہی خاموش چلتے رہے۔ کوئی کسی سے مخاطب نہیں ہوا۔ پھر ایک آواز نے ہمارا پیچھا کیا۔ وہ تیز قدم چلتے ہوئے گاؤں کی طرف بھاگنے لگی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے کھیتوں میں جانور گھس آئے تھے۔ وہ فصل کو روندتے ہوئے فصل کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ تمام فصل روند دی گئی تھی۔ میں نے چاہا کہ میں ان جانوروں کو اس عورت کے کھیت سے باہر نکالوں۔ میں نے ان کو نکالنے کی پوری کوشش کی مگر وہ سب مجھ پر ہی جھپٹ پڑے میں لہولہان ہو گیا تھا۔ تمام فصل برباد کی جا چکی تھی۔ اب اس کھیت میں کوئی دانہ باقی نہیں تھا۔ پھر کالی زمین پر دم توڑتا ہوا شہر چیخنے لگا۔ بھوک' بھوک۔ بھوک۔ پھر مجھے خیال آیا کوئی بھی حادثہ کبھی بھی ہو سکتا ہے۔ جنگ کسی وقت بھی ہو جائے۔ زمین کسی بھی وقت پھٹ جائے۔ کاش وہ بادل برس گیا ہوتا تو ممکن تھا کالی زمین پھر شاداب ہو جاتی۔ تروتازہ ہو جاتی !!

—— ⁂ ——

خلش

شہناز فاطمہ
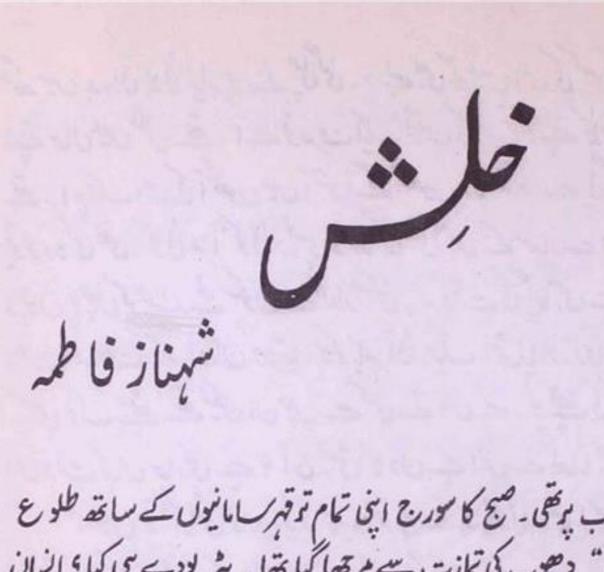
گرمی اپنے شباب پر تھی۔ صبح کا سورج اپنی تمام تر قہر سامانیوں کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔ "منی پلانٹ" دھوپ کی تمازت سے مرجھا گیا تھا۔ پیڑ پودے ہی کیا؟ انسان بھی اس گرمی سے پریشان تھے۔ اور عروج گلاب کے گملے کے پاس کھڑی ہوئی اس کے مرجھائے ہوئے پتوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ ان مرجھائے ہوئے پتوں کی طرح اس کا دل بھی مرجھا چکا ہے۔ وہ تھک گئی ہے۔ اسے ہر وقت اپنے اعصاب پر ایک بھاری بوجھ نظر آتا۔ وہ اپنے آپ سے کہتی۔

"میری بھی کیا زندگی ہے؟ آفس کی تھکاوٹ اور گھر کے لڑائی جھگڑے نے دماغ مفلوج کر دیا ہے۔ آخر میں کیا کروں"؟ آج اس کا دل کہیں بھی نہیں لگ رہا تھا۔

گلاب کے گملے کو دیکھتے ہوئے وہ متواتر اپنے متعلق سوچے جا رہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے سے وہ چونک پڑی۔ دوڑ کر اس نے فون اٹھایا۔

"ہیلو! عروج اسپیکنگ!"

دوسری جانب آفس کا فون تھا۔ اسے اسی وقت کسی ضروری کام سے آفس بلایا گیا تھا۔ اپنے آپ پر اسے غصہ آ گیا۔ اچھی پریشانی ہے۔ چھٹی کے دن بھی چین نہیں لینے دیتے۔ کام زیادہ ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ اور بھی دوسرے ورکر ہیں آفس میں۔ مگر میرے ہی گلے میں پھانسی کا پھندہ ہر وقت کیوں ڈالا جاتا ہے؟ وہ منہ ہی

منھ میں بدبداتی ہوئی تیار ہونے چلی گئی۔ ویسے بھی گھر میں اس کی کسی کو کیا پرواہ تھی۔ سبھی اپنے حال میں مگن تھے۔ اسے تو صرف ایک مشین کی طرح اپنے کام انجام دینا ہوتے تھے۔ اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جنھیں وہ ضبط سے پی گئی۔ زندگی بے معنیٰ ہوکر رہ گئی تھی۔ کوئی مزا، کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی جس کے سہارے وہ زندگی کی ان طویل راہوں پر چل کر چند لمحے سکون سے گذار سکتی۔ ہر وقت کی گہما گہمی سے گھبرا اٹھی تھی۔ انھیں خیالات کے دوران وہ تیار ہوکر باہر آئی۔ بیگ اٹھایا اور روانہ ہوگئی۔ اگرچہ سامنے سبھی لوگ بیٹھے تھے لیکن ان میں سے کسی نے اس سے یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ اس وقت کہاں جا رہی ہے؟ آج چھٹی کا دن ہے اس نے کھانا بھی کھایا یا نہیں؟

انھیں تو فکر تھی تو بس یہ کہ مہینہ ختم ہوتے ہی تنخواہ دی یا نہیں۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتی ' یا خدا! ان کے دل میں ذرا بھی جگہ نہیں۔ میرے لئے کوئی ہمدردی نہیں ہے کہیں بھی کسی بھی لمحے کوئی تڑپ نہیں ہے۔

وہ سوچتی' روٹی کپڑے سے تو انسان پیٹ بھر سکتا ہے' تن ڈھک سکتا ہے لیکن یہ کسی نے نہیں سوچا کہ پیار کی کمی کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

اور جب ٹیکسی رُکی تو اسے احساس ہوا کہ اس کا آفس آگیا ہے' اسے یہیں اترنا ہے۔ آفس پہنچ کر وہ باس کے کمرے میں پہنچی۔ انھوں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور جب باس اپنے کام سے فارغ ہوئے تو انھوں نے اس کو مخاطب کیا۔ " مس عروج یہ کچھ ضروری لیٹرس ہیں۔ انھیں جلدی سے ٹائپ کر دیجئے گا۔" اسی لئے آج آپ کو زحمت دی ہے۔" اور باس کے یہ کہنے پر وہ جل ہی تو گئی۔ لیکن خاموش رہی اور تمام لیٹرس لے کر کھڑی ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد جب لیٹرس ٹائپ ہو گئے تو وہ باس کے پاس پہنچی۔ باس نے تمام لیٹرس اس سے لے کر اس کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور کہا کہ میں ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ دو گھنٹے میں لوٹوں گا جب تک آپ یہاں کی ذمہ داری سنبھالیں۔ آپ کی مدد کے لئے مسٹر مہرا یہاں موجود ہیں۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے ان کے

ہدایات سنتی رہی۔ کرتی بھی کیا؟ تقریباً چار گھنٹے بعد باس لوٹ کر آئے۔ اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی۔

وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی گھر پہنچی۔ توخلافِ توقع گھر میں سبھی اُس کی آمد کے منتظر تھے۔ انھوں نے اس پر طرح طرح کے الزامات لگائے اور وہ اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی۔ کہتی بھی کس سے یہاں تو کوئی بھی اس کا اپنا نہیں تھا۔ جس سے وہ کچھ کہہ سکتی۔ وہ خاموشی سے ان نشتروں کو اپنے دل پر سہہ گئی یہ سوچ کر کہ تاریکی کے بعد روشنی ضرور ہوتی ہے۔ وہ ظلم کے خلاف آواز ضرور بلند کرسکتی تھی لیکن یہاں تو اس کے اپنے ہی اسے ظلم کی صلیب پر لٹکا دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو وہ کیا کرے؟ اس نے اتنا بے بس اپنے آپ کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر وہ خاموشی سے اس زہر کو پیتی رہی کہ کبھی تو وقت کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں آئے گی۔ دن اور رات اسی طرح بے کیف گزرتے رہے۔

گھر سے آفس، آفس سے گھر... اس کا روزمرہ کا معمول بن گیا۔ لیکن اس اندھیارے میں بھی آشا کے جگنو جگمگا اٹھے اور وہ اپنے زندگی کے اندھیرے کو بھول کر اس جگنو کی روشنی میں کھو گئی۔

آذر اس کی زندگی میں بہار بن کر آیا۔ اس کی سنگت میں زندگی میں تھوڑا نکھار آگیا تھا۔ اچانک اسے اتنی خوشیاں ملیں کہ وہ حیران رہ گئی۔ آذر اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اس دن اچانک دونوں کا سامنا جو ہوا تو ساری گزری ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔

"ہیلو!" آذر نے عروج کو مخاطب کیا۔ عروج نے بھی جواباً ہیلو کہا۔ پھر دھیرے دھیرے آذر عروج میں دلچسپی لینے لگا اور عروج سے ملنے کے بہانے وہ روز آفس آنے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں محبت میں تبدیل ہوتی گئیں۔ دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ آپس میں عہد و پیماں ہوئے لیکن قدرت کو عروج کا ابھی ایک اور امتحان لینا مقصود تھا۔ آذر بہار کا ایک جھونکا بن کر اس کی زندگی میں آیا اور اُس کو خزاں کے

سپرد کر کے چلا گیا۔ وہ پھر ایک بار تنہا ہو گئی۔ کیا یہ خوشیاں عارضی تھیں؟
آذر کیوں اسے چھوڑ کر چلا گیا.....؟

اور پھر وقت کی تنہائیوں میں جوجھتے ہوئے ایک دن عروج نے آذر کے بیٹے کو جنم دیا۔ عروج بیٹے کی پرورش میں دل و جان سے لگ گئی۔ ہر ہر پل وہ آذر کے آنے کا انتظار کرتی رہی لیکن آذر لوٹ کر نہیں آیا۔ اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔

پھر کئی سال گزر گئے۔ آذر کا بیٹا اشہر بڑا ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک پھانس اس کے دل میں چبھی ہوئی تھی جسے وہ کسی پل دل سے نہیں نکال سکی تھی۔ گزرتے لمحوں کے ساتھ اس کی خوبصورت کالی گھٹاؤں جیسی زلفوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے۔ اب عروج کو اپنے بیٹے اشہر کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔

ایک دن اس نے اشہر سے کہا۔ "اشہر بیٹے! اب میں بہت تھک گئی ہوں میں چاہتی ہوں کہ اب یہ بقیہ زندگی اپنی بہو کے ساتھ گزاروں۔ اگر تمہاری کوئی پسند ہو تو بتا سکتے ہو۔" اور اشہر اپنی ممی کی اس بات پر ان کے گلے سے لگ گیا۔ "اوہ ممی! واقعی آپ بہت ہی گریٹ ہیں۔ سچ ممی جب آپ عینی سے ملیں گی تو بہت خوشی محسوس کریں گی۔"

عروج نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں خوشیوں کی چمک دیکھ لی تھی۔ اشہر کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ آخر عروج نے اشہر سے پوچھا۔ "اشہر بیٹے! عینی کون ہے؟ کس کی لڑکی ہے؟ ان کے والد کا نام تو بتاؤ؟ تمہاری اس سے ملاقات کہاں ہوئی؟ کیسے ہوئی؟"

"اوہ ممی! عینی میری بہترین دوست ہے اور میں اسے اپنی زندگی کا حصہ دار بنانا چاہتا ہوں۔ اس کے پاپا، ممی کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ ویسے آپ کہتی ہیں تو معلوم کر لوں گا۔"

عروج نے کہا۔ "بیٹے! کل تم مجھے پہلے عینی سے ملوا تو دو۔ تاکہ پہلے میں اپنے بیٹے کی پسند دیکھ لوں۔ اس کے بعد کچھ فیصلہ کر سکوں گی۔ اب ہم بہت جلد اپنے فرض سے

سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں۔"

اشہر نے کہا "ٹھیک ہے ممی کل آپ تیار رہیئے گا۔ میں عینی سے بھی کہہ دیتا ہوں کہ کل تمہیں دیکھنے میری ممی آرہی ہیں۔" اشہر کی بات پر عروج مسکرا دی۔

دوسرے دن اشہر اپنی ممی کو لے کر عینی کے گھر پہنچ گیا۔ پھر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ڈرائنگ روم میں اس کے سرہانے آذر کھڑا تھا۔

آذر اور عروج دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے اور گزرے ہوئے کل کی جھلکیاں تکلیف دے رہی تھیں۔ عروج کا قیاس حقیقت کی نقاب اٹھا چکا تھا۔ حقیقت ماضی کی آنکھوں میں اشک لئے اس کے سامنے کھڑی تھی جسے اب عروج حال کی نظر سے دیکھ رہی تھی اور قدرت کی اس ستم ظریفی پر غور کر رہی تھی جس نے آج اُسے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی کافی دور تھے۔ اسے آذر کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات ایک ایک کر کے یاد آرہے تھے۔

بدگمانیوں نے ان کی زندگی میں کڑواہٹ گھول دی تھی اور وہ اس تلخی کو زیادہ برداشت نہیں کر سکی تھی اور اپنے والدین کے پاس لوٹ آئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ہی سے آذر نے دوسری شادی کر لی اور انھیں دنوں عروج نے اشہر کو جنم دیا۔ جو اس کی تنہائی کا واحد سہارا بن گیا۔ اور عروج اشہر کے سہارے ہی اپنی زندگی کے سُونے گلستاں کو مہکاتی رہی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ آذر نے عروج کو طلاق بھی نہیں دی۔ اس نے عروج کے اعتماد کو گہری چوٹ پہنچائی تھی۔ آذر نے کبھی اپنے بیٹے کو دیکھنے کی بھی خواہش نہیں کی تھی۔ وہ اپنی دوسری دنیا میں مگن تھا۔ ادھر آذر کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ بھی یہی سوچ رہا تھا۔ دونوں ہی اپنی جگہ ایسے موڑ پر کھڑے تھے جہاں وہ اپنے بچوں کی خواہشوں کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔

اب وہ کس طرح اپنے بچوں کی زندگی میں خوشیوں کا رنگ بھریں جب کہ وہ تو سر تا پا حیرت میں ڈوبے قدرت کے اس اَن ہونے مذاق کو دیکھ رہے تھے۔

اِدھر عروج کبھی عینی کو دیکھتی تو کبھی اپنے بیٹے اشہر کو اور کبھی اس کی نظریں آذر پر جاکر ٹک جاتیں۔ دونوں فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ ان بچوں کو کس طرح یہ روح فرسا خبر سنائیں کہ دونوں کبھی رشتہ ازدواج میں نہیں بندھ سکتے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ زندگی کے کسی موڑ پر یہ تلخ کہانی جوان کی زندگی کا المیہ ہے آگے چل کر ایک دردناک موڑ اختیار کر جائے گی۔ دونوں اپنے ہی بچوں کی آرزوؤں کا خون ہوتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھے ہوئے تھے۔

اس خاموشی کو اشہر نے ہی توڑا۔ "ممی آپ کیوں خاموش ہیں؟ ..... اس طرح آپ کیا سوچنے لگیں .....؟"

اُدھر عینی بھی اپنے پاپا آذر سے کہہ رہی تھی۔ "پاپا آپ کچھ تو بولئے پاپا۔ آپ لوگ اس طرح خاموش کیوں ہیں؟ ... کیا آپ کو ....."؟ اور عروج نے بیچ میں ہی عینی کی بات کاٹ لی اور اشہر سے مخاطب ہوئی۔ "اشہر بیٹے۔ جاؤ اپنے پاپا کے گلے لگ جاؤ۔"

"لیکن ممی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے تو آپ نے کبھی نہیں بتایا ...." اور اشہر کی آواز رندھ گئی .....

عینی کی آنکھوں میں بھی موتی جھلملا رہے تھے۔ جسے وہ خاموشی سے اپنے آنچل میں جذب کر رہی تھی۔

عروج نے اشہر سے کہا۔ "ہاں بیٹے یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت سے ہم میں سے کوئی بھی اپنا دامن بچاکر نہیں بھاگ سکتا۔ بس بیٹے تمہارے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ آذر تمہارے وہی پاپا ہیں، جنہیں بارہا تم نے مجھ سے پوچھا ہے اور عینی تمہاری بہن ہے۔ ..."

تمہیں اس بات کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ بیٹے یہ سب کچھ انجانے میں ہوا ہے۔ جو سامنے ہے وہی سچ ہے 'حقیقت ہے۔"

..... وہ رونے لگی تھی۔

آذر جو کافی دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی علینی کو مخاطب کیا "بیٹی! ہم سبھی سے انجانے میں بھول ہو گئی ہے۔ جاؤ بیٹی عروج تمہاری بھی ماں ہے۔"

"جاؤ بیٹی جاؤ اس کے گلے لگ جاؤ۔ تمہاری ماں کے مرنے کے بعد میں نے تمہیں ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا ہے۔ لیکن آج میں تمہیں عروج کو سونپتا ہوں۔ تمہیں تمہاری ماں مل گئی ہے۔"

اور شدتِ غم سے علینی چیخ اٹھی۔ "نہیں پاپا نہیں ..... کہہ دو پاپا کہ یہ سب ایک مذاق ہے۔ پاپا کیا اس طرح بھی محبت کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔" علینی سے رو رہی تھی۔

آذر اور اشہر کی آنکھوں سے بھی اشک رواں تھے اور عروج نے آگے بڑھ کر علینی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا دل کرچیں کرچیں ہو گیا۔ لیکن ممتا نے اسے مجبور کر دیا۔ جذبوں کی صداقت پر قدرت بھی حیران تھی۔

عروج نے اشہر اور علینی دونوں کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اور اس ایثار پر فرشتے بھی رشک کر رہے تھے۔

عروج اور آذر نے ایک دوسرے کو معاف کر دیا لیکن ایک بے نام خلش سے اب بھی ستاتی ہے۔

—— ⁂ ——

وہ کون تھی؟

صادق بہار ٹونکی

وہ ایک ٹھٹھری جنوری کی شام تھی، ڈیوٹی کا ٹائم آف ہو رہا تھا۔ میں اور رام کمار گھر جانے کے لئے لفٹ سے نیچے اترے اور کینٹین میں جا گھسے۔ "کارنک بوزح" سے "الہاس نگر" کا لمبا سفر "لوکل ٹرین" سے جوجھتے کرنا تھا۔ دو گرم گرم چائے کے پیالوں کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

جب تک چائے آئے، میں نے اخبار اٹھایا، اچانک میری نظر سرورق پر چھپے اس تصویر پر پڑی جس کو دیکھ کر ہم دونوں چونک پڑے، میں نے جھٹ پٹ پوری نیوز پڑھ ڈالی۔ تصویر کے اوپر کا ٹائٹل تھا وہ کون تھی؟ ڈیٹیل میں لکھا تھا۔ "کل یہ عورت اسٹیشن کے پلیٹ فارم تین پر مردہ پائی گئی، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے دو باتیں سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ماں بننے والی تھی، اور دوسری بات یہ کہ اس کی موت خواب آور گولیاں، کثرت سے کھانے کی وجہ سے عمل میں آئی۔

وہ یہاں تک کیسے آئی؟ کہاں کی رہنے والی تھی؟ اس کا کچھ پتہ نشان نہ تھا، پولس والوں کو حیرت تھی کہ نہ تو کسی تھانے میں گم شدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی، اور نہ دو دن تک اس کی لاش کو کوئی لینے کے لئے مردہ خانے ہی آیا، تفتیش جاری تھی۔ اس کی مانگ کا سیندور اس امر کا گواہ تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور دنیا میں آنے سے پہلے، اسے دنیا سے جانے والے بچے کا باپ اس بمبئی کے انسانی جنگل میں کہیں نہ کہیں منہ چھپائے

بیٹھا ہے۔

بمبئی والوں کے لئے تو یہ خبر کوئی خاص خبر بھی نہ تھی' کیوں کہ ایسے واقعات ان کے معمولاتِ زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔

بمبئی نگری بھی کتنی عجیب نگری ہے۔ جہاں فلک بوس عمارتوں کے ایر کنڈیشنڈ کمرے تو کتوں کی رہائش کے لئے وقف ہیں۔ لیکن۔ انسان ۔ گندی فٹ پاتھوں پر ــــ کیڑے مکوڑوں کی طرح' رینگتی' بسورتی اور دم توڑتی زندگی گذارتے ہیں اور شب و روز کی ذلت آمیزیوں کی شراب میں سوڈے کی جگہ خونِ جگر ملا کر پی کر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جب ذرا ہوش آتا ہے تو انسانیت سوز کاروبار دیکھتے اور نظریں جھکا لیتے ہیں۔

یہ مہانگری وہ مہانگری ہے جو سمندر کے کنارے آباد ہے' جہاں پیاسا' پیاس سے مر تو سکتا ہے لیکن زندہ رہنے کے لئے دو گھونٹ پانی سے اپنا خشک حلق تو نہیں کر سکتا۔ اس انوکھی نگری کی ایک قاتل ادا یہ بھی ہے کہ یہاں چل پھر کر دو جون روٹی کا جگاڑ تو کیا جا سکتا ہے' آسانی سے شادی بھی ہو سکتی ہے لیکن دو گز زمین میسر نہیں آتی' اور یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا ــــ دن تو آفس کی مصروفیات میں گذر جاتا' لیکن رات! ایک سوالیہ نشان بن کر آتی اور کاٹے سے نہیں کٹتی۔ حالانکہ بمبئی آ کر تنخواہ میں اضافہ ہوا تھا۔ کئی نئے بھتے بھی مل رہے تھے۔ اگر نہیں ملتا تھا تو کمبخت ایک کمرہ' کسی صورت نہیں ملتا تھا۔

میرے گاؤں کا بچپن کا دوست رام کمار جیسے تیسے الہاس نگر میں دو کمرے والے ایک فلیٹ میں اپنی فیملی کے ساتھ دن گذار رہا تھا۔ اب میں بھی اس میں شامل ہو گیا وہ اخلاقاً مجھے برداشت کر رہا تھا' لیکن اس کا یہ اخلاق خود میرے لئے سوہانِ روح بننے لگا' اور ایک ایک کر کے ساٹھ دن نکل گئے۔ اس کی بیوی کے تیور بھی کچھ بیزاری کی نشاندہی کرنے لگے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا' ہم دونوں دوست جب وقت ملتا مکان کی تلاش میں نکلے کھڑے ہوتے اور بے نیل و مرام لوٹ آتے۔ کتنے ہی اتوار اور کتنی ہی چھٹیاں برباد کر چکے تھے انھیں گذشتہ واقعات کے بھنور میں غوطے کھاتا میں لوکل ٹرین میں جا چڑھا۔

دو مہینے کرایے کے فلیٹ میں رہ کر اب پھر ۱۵ار دن سے رام کمار کے گھر لوٹ آیا تھا۔ ٹرین میں تیرتھ کو پھر غیر ارادی طور سے اخبار میں چھپی تصویر ذہن میں ابھری' جو بلاشبہ راجیشوری کی تھی۔ اور جس کو میں اور رام کمار پہچان چکے تھے۔

وہ کون تھی ؟ کوئی جانے یا نہ جانے ہم ضرور جانتے تھے' اب یہ دوسری بات ہے کہ حالات کی برف باری نے ہماری زبانیں شل کر دی تھیں۔ ٹرین اپنی رفتار سے اڑ رہی تھی اور ہم اپنے خیالات کے پیروں کے سہارے سرگرم سفر تھے۔

غیر ارادی طور سے راجیشوری کے ساتھ گزرے پچھلے دو مہینے کا ایک ایک واقعہ فلمی سین کی طرح آنکھوں میں گھومنے لگا۔ راجیشوری سے جان پہچان بھی مکان کی تلاش کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ رام کمار کا دوست جو بھنڈی بازار کی تنگ گلی میں رہتا تھا اس کے پاس چار کمروں والا ایک سیپریٹ فلیٹ تھا۔ دو کمروں میں اس کی رہائش تھی اور دو بالائی کمرے سر دست خالی تھے۔ مین گیٹ چاروں کمروں کا مشترک تھا۔

میں اور رام کمار جب مالک مکان سے ملنے گئے' تو وہ نشے میں دھت اپنی شریمتی سے الجھا ملا۔ جھگڑا شاید فوٹو گراف کو لے کر ہوا تھا۔

ہماری کال بیل سن کر وہ ایسے چپ ہو گئے جیسے کسی تیز رفتار کار کو اچانک بریک لگ گیا ہو۔

ہم اندر داخل ہوئے' اس کے دوست کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا' اور سفارشی لیٹر بھی ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر اس نے سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور اس قدر سوالات داغے کہ بس توبہ ہی بھلی۔ اور پھر شروع ہو گیا پچھلے کرایہ داروں کی بد چلنی' بد دیانتی کا فرضی رونا رونے ہم نے اپنی شرافت کا یقین دلایا اور اس کے طلب کرنے پر بغیر اونچ نیچ کا خیال کئے تین مہینے کا ایڈوانس کرایہ پیش کیا۔ دوسرے دن شفٹ ہونے کی بات کہی۔ اسی درمیان میں اس کی شریمتی نے گرم جوشی کا اظہار کرتے ہوئے چائے سے ہماری تواضع بھی کی۔

دوسرے دن ـــــ جب ہم ٹیکسی میں اپنا مختصر سا سامان لئے پہنچے تو مالک مکان راجندر ناتھ نے جھومتے جھامتے دروازہ کھولا اور اشارے سے زینہ بتا دیا۔ ابھی

ہم نے ٹھیک سے اپنا سامان بھی سیٹ نہیں کیا تھا کہ ہماری مالکن راجیشوری چائے کے ساتھ گرم گرم پکوڑیاں لئے اوپر آگئی۔ میں نے کہا "شریمتی جی! آپ کو اس تکلیف کی کیا ضرورت ...... جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی ۔"مسٹر دیکھئے۔ جب آپ ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہیں گے تو پھر بھلا یہ تکلیف و تکلف کے رسمی الفاظ کیوں دہرائیں جائیں۔ یہ بمبئی ہے لکھنؤ نہیں ...... اور ہاں .... اس روکھے سوکھے رویے سے کام چلنے والا بھی نہیں ...... وہ پھر بولی "بس گرم پکوڑیوں کو سرد مہری کی سزا نہ دیجئے۔ کھائیے' کھائیے ورنہ میں زبردستی بھی منہ میں ......" اور وہ اس کے آگے کچھ کہے ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ پھر وہ چلی گئی' میں لیٹ گیا اور رام کمار گھر لوٹ آیا' لیکن مجھے اس کی پہلے دن ہی کی یہ بے تکلفی کچھ عجیب سی لگی۔ دل نے کہا "کہ یہ بمبئی ہے میری جان" اور پھر میں نے ۔۔ سو جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

اکثر مجھے گھر لوٹنے میں دیر ہو جاتی اور صبح جلدی ہی آفس کے لئے نکل جانا پڑتا۔ ایک بار میں دیر رات کو لوٹا۔ بجلی بھی آنکھ مچولی کھیلتی ملی۔ ماحول بھی اداسی کی چادر تانے سو رہا تھا۔ جب میں صدر دروازے تک پہنچا تو راجیشوری اور اس کا پتی راجندر کی بڑی تیز قسم کی تکرار چل رہی تھی۔ میں دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اندر راجیشوری غصہ سے گلنار بنی کہہ رہی تھی ۔"تم نے میری زندگی نرک بنا دی' یہ روز روز کی ناٹک سے تو اچھا ہے کہ مجھے کسی کوٹھے پو لے جا کر بیچ آؤ اور پھر اسی قیمت سے اتنی شراب پیو کہ شراب تمہیں پی جائے۔" راجندر غصہ سے پاگل ہوتے ہوئے بولا۔" کل کلنکنی! اب اس سے آگے ایک اکشر بولی تو میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔" یہ سن کر راجیشوری نے بڑا بھیانک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔" اوہ' وہ تو میری مکتی کا پوتر دن ہو گا۔ مجھے کم سے کم روز روز شریف لوگوں سے پیار کا ناٹک تو نہ رچانا پڑے گا اور تمہارے ۔ بلیک میل کے دھندے کے لئے شرمناک فوٹو تو نہ کھنچوانا ہوں گے۔"

اچانک بجلی بھی فل پاور پر لوٹ آئی' ادھر ہوا نے بھی پٹوں کو چوپٹ کر دیا' مجھے مجبوراً اندر آجانا پڑا۔ وہ دونوں میری غیر متوقع آمد پر گھبرا سے گئے' راجیشوری نے حالات

کو سنبھالتے ہوئے کہا ــ" ارے بابو آج تو ان ٹائم آگئے ہوتے۔ دیکھ نہیں رہے۔ سردی نے بمبئی کو شملا بنا دیا ہے۔ میں جب تک کافی لاؤں آپ راجندر صاحب کے پاس ہیٹر کے پاس آجائیں۔"

لیکن میں سنی ان سنی کرتا ہوا اوپر کے کمرے میں آگیا اور کپڑے تبدیل کر کے اپنے لحاف میں جا گھسا۔ اسی وقفہ میں کال بیل پھر بجی۔ ٹیکسی سے کچھ لوگ راجندر کے پاس آئے اور اس کو باہر لے گئے۔ راجندر نے راجیشوری کو بلند آواز میں کہا۔" میں نے گیٹ اندر سے لگا لینا۔ ممکن ہے کہ میں رات کو نہ لوٹ سکوں۔" اور پھر ٹیکسی کے اسٹارٹ ہونے اور دروازہ بند کرنے کی ملی جلی آوازیں میرے کان سے ٹکرائیں۔

چند ہی لمحے بعد راجیشوری دو کافی کے پیالے لئے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ چونکہ میں ان دونوں کی باتیں سن چکا تھا اور ان کا گھناؤنا کردار بھی دیکھ رہا تھا۔ اب میرے سامنے یہ راز بھی کوئی راز نہ رہا کہ اس فلیٹ کے کرایہ دار مہینے دو مہینے میں سے اپنا سامان چھوڑ کر کیوں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ آج پہلی بار بحیثیت ایک بازاری عورت کے میں نے اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔

وہ ایک ۲۴' ۲۵ سالہ متناسب قد و قامت والی خوش اندام' جاذب نظر عورت تھی۔ اس نے نائیلون کے گاؤن پر بس یوں ہی سا شال ڈال رکھا تھا لیکن اس کے جسم کا ہر رنگ دعوتِ نظارگی دے رہا تھا۔ رنگت دودھ شہاب' ہرنی جیسی چنچل آنکھیں' ہونٹ ایسے جیسے تراشیدہ یاقوت کی دو قلمیں اوپر نیچے رکھ دی گئی ہوں۔ اس پر قاتل ادا یہ کہ چاہِ زنخداں ہر چاہ کے لئے چاہِ شباب بن جائے۔ پھر آج تو اس کے بدن سے نکلے خوشبوؤں کے جھونکے بدمست کئے دے رہے تھے۔ اس نے مجھے نگاہِ غلط انداز سے دیکھا اور بڑی لگاوٹ کے ساتھ میرے بیڈ میں گھس آئی پھر مسکرا کر بولی" میرے حضور! دل جلانے کے لئے کافی اور جسم کی ٹھنڈک مٹانے کے لئے۔ . . سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی ــ ادھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے۔ . .

میں لحاف پھینک کر کھڑا ہوگیا اور ایک دم تیور بدل کر بولا ۔ " میڈم ! بس کیجئے آپ کو کرایہ دار کی اور مجھے سر چھپانے کو ایک چھت کی ضرورت تھی ۔ دونوں کے کام ہو چکے اس نچھمن ریکھا کو ادلگانے کی ضرورت نہیں، ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا ۔ پھر وہ نیم برہنگی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی ۔ " ظالم یہاں انجام کی فکر کس کو ہے ۔ " میں اس پر برس پڑا " افسوس تم جیسی سماج کی ناسور عورتیں اپنے گھرانے کی عزت آبرو کی چتا جلاکر دوسرے باعزت لوگوں کی زندگیوں کو بھی نرک بنا ڈالتی ہو، میں تو خیر کل چلا ہی جاؤں گا لیکن تم ٹھنڈے دل سے اتنا ضرور سوچنا کہ جب اس جوانی کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی اور لعنت اور آلودگی کی اوڑھنی تمہارے سر پڑی ہوگی تو تم اپنا اور اپنے بے غیرت پتی کا پیٹ کس طرح پالوگی ؟ ......

میں بولتا رہا اور وہ خاموش کھڑی ہندوستانی معصوم اور بے بس عورت کی طرح ندامت کے آنسو بہاتی رہی ۔ پھر وہ بلک بلک کر روتے ہوئے بولی ۔ " بس بس بھگوان کے لئے بس کیجئے " اچھا جی تو آپ کا بھی بھگوان ہوتا ہے ؟ " کیوں نہیں ؟ یہ ساری ناانصافی اسی کی تو ہے ۔ اس نے ہی ایک غریب پریوار میں جنما، جہیز کے ناگ نے ڈسا اور راجندر جیسے راکشس نے مجھے اس حال پر پہنچا دیا کہ مجھے خود اپنے وجود سے نفرت ہو چلی ہے ۔ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ۔ " بس بس دوسروں کو دوش دینے سے پہلے اپنے دوش پر نظر ڈالو، ارے تم کچھ نہیں کر سکتی تھیں تو تم سے مرنے کا ادھیکار تو کسی نے نہیں چھین لیا تھا ؟ "

" بابوجی آپ نے سچ کہا اب میں اور زیادہ اپنی نظریں نہیں گروں گی، مگر ہاں کل صبح تک آپ بھی یہ کمرہ ضرور چھوڑ دینا ۔ " اور اس نے اپنے پلّو سے سارے آنسو پونچھ لئے اور اپنے بیڈ تک چلی گئی ۔

اچانک دروازہ پھر کھلا اور راجندر، اس کا دوست کمرہ میں اور ایک باوردی آدمی بالکل لیس ہو کر اندر داخل ہوئے ۔ خلاف امید انھوں نے راجیشوری کو اس کے بستر پر پایا ۔ غصہ سے لال پیلا ہو کر راجندر نے پوچھا ۔ اری کمبخت تونے یہ آج کا پروگرام کیوں چوپٹ کر ڈالا ۔ " راجیشوری نے اطمینان سے جواب دیا " کوئی ضروری نہیں کہ ہر چڑیا ایک

ہی دانے پر آ پھنسے ۔ سردی بہت ہے ادھر اگر آپ بھی سو جائیں ' اور اپنے دوستوں کو بھی رخصت کر دیجئے ...... وہ بڑبڑاتا رہا اور نہ جانے کب سو گیا '... لیکن جب اس کی صبح آنکھ کھلی ہوگی تو وہ دیکھ کر حیران ضرور رہ گیا ہوگا کہ میں اپنے سامان سمیت غائب ہوں .....
ٹرین رک چکی تھی ۔ ہماری منزل بھی آگئی تھی اور ہمیں یہ سوچنے میں ذرا دیر نہیں لگی کی راجیشوری نے ضمیر کی آواز پر اپنا آخری ادھیکار استعمال کر ہی لیا ۔

رشتے درد کے

عارفہ سلطان

نوشین نے جس لمحے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں اس لمحے سے نوید نے اس کو چاہا....

نوشین اور نوید ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ نوشین کی امی اور نوید کی امی ایک دوسرے کی زبردست فین عاشق ایک دوسرے پر مرمٹنے والی سہیلیاں تھیں۔

نوشین جب گدیلی پوٹلی ٹکر ٹکر آنکھیں گھما رہی ہوتی تو نوید اس کے ہاتھوں کو پیار سے اپنے ہاتھوں میں لئے ہوتا۔ جب اس نے چلنا سیکھا تو نوید کی انگلی پکڑ کر، بھاگنا سیکھا تو نوید کے پیچھے، پڑھنا سیکھا تو نوید اس کا استاد بنا۔ غرض زندگی کے ہر نشیب و فراز میں نوید اس کا ساتھی بنا۔ اگر نوشین سے کوئی زور سے بات کرلیتا تو نوید مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا۔

دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے..... مگر زمانہ کی گردش سے بھی کوئی بچا ہے نہ بچ سکتا ہے۔ وہ کب کیا گل کھلاتی ہے کوئی نہیں جانتا۔ اچانک نوید کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ ابھی آٹھویں کلاس میں ہی پڑھتا تھا۔ لیکن سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے ساری ذمہ داریوں کا بوجھ اسی کو اٹھانا پڑا۔

ویسے ہی ان کے گھرانے کی مالی حالت بہت کمزور تھی اس پر ستم یہ کہ جو آمدنی کے اصل ذرائع تھے وہ بھی ختم ہو گئے۔ نوید کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کبھی وہ آٹے کی چکی پر کام کرتا، کبھی پولس کے لئے مخبری کرتا تو کبھی سڑکوں پر آواز لگا کر اخبار بیچتا۔

غرضیکہ زندگی گذارنے اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے وہ ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرتا اور کسی طرح اپنا گھر چلاتا۔ کچھ پیسہ ماں سلائی کرکے کمالیتی لیکن پھر بھی چار افراد کا خرچ بڑی مشکل سے چل پاتا۔ جب شام کے وقت نوید اپنی کتابوں کو پیار سے ہاتھ میں لیتا تو اس کا رواں رواں مسرت سے ناچ اٹھتا۔ وہ ہر حال میں یہی کوشش کرتا کہ کسی طرح اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہے۔ اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ میٹرک کرنے کے بعد اس نے ٹائپ سیکھا اور بعد میں اسے ایک آفس میں سروس مل گئی جو بہت معمولی تھی۔ لیکن پھر بھی باعزت تھی۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی لیاقت اور ذہانت سے ترقی پر ترقی کرتا گیا اور اس نے دوبارہ اپنے کھوئے ہوئے سماجی وقار کو حاصل کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چھوٹا سا بزنس بھی شروع کردیا۔ نوید کو رفتہ رفتہ اس میں بھی اچھا منافع ہونے لگا۔ جس سے اس کی مالی حالت کافی مضبوط ہوگئی۔

اِدھر نوشین اپنے گھر کی اکلوتی لاڈلی تھی۔ اس کے والد دولت مند تو نہیں تھے لیکن پھر بھی اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ نوشین کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ نوشین اگرچہ پڑھائی میں نوید سے کافی پیچھے تھی لیکن جس عرصہ میں نوید نے پڑھائی چھوڑ دی اس دور میں بھی وہ پڑھتی رہی۔ نوید ہر لمحہ اس کا حوصلہ بڑھاتا۔ اس سے بڑی پُرلطف باتیں کرتا۔ اس کو ذرا سا بھی دکھی ہونے نہیں دیتا۔ نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس نے نوید کو ہر لمحہ نوشین کا خیال رکھنے پر مجبور کئے رکھتا۔

نوشین بھی دل و جان سے نوید کا خیال رکھتی تھی۔ نوید کے گھر والوں کو اس کے ضرورتوں کا اس کے دلی رازوں کا پتہ نہ ہوتا تھا لیکن نوشین اس کے ہر راز کی امین۔ اس کے ہر ارمان پر قربان ہونے والی اور اس کی ہر ادا پر مر مٹنے والی تھی۔

نوید نے میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی کیوں کہ اس کو سروس بھی مل گئی تھی اور بزنس کے ذریعہ وہ اچھا خاصہ پیسہ کمالیتا تھا۔ لیکن نوشین پڑھتے پڑھتے ڈاکٹر بن گئی۔ یہی اس کی بدنصیبی تھی کہ وہ پڑھائی میں نوید سے آگے نکل گئی۔ ویسے نوید اس کے پاس ہونے پر

ہر بار ایسے خوش ہوتا جیسے وہ خود پاس ہوا ہو۔ رشتہ داروں میں، محلہ پڑوس میں نوید کی طرف سے مٹھائی بانٹی جاتی اور ایک ہنگامہ سا کھڑا ہو جاتا۔

ایک دن نوید نے دھیمی آواز میں بڑے رازدارانہ طریقے سے نوشین سے کہا۔ "تم نے کائنات کو دیکھا ہے جو میری خالہ کی بیٹی ہے؟"..... اتنا سنتے ہی جیسے نوشین کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ کہیں نوید کائنات پر اپنی کائنات تو نہیں وار بیٹھا؟..... کیونکہ وہ ہے ہی اتنی حسین کہ کوئی بھی اس کو دل و جان سے چاہ سکتا ہے۔ اس کی نرگسی آنکھیں جس طرف اٹھ جائیں ہر کسی کو اپنا بیمار بنا سکتی ہیں۔ اس کی گھنیری زلفیں، لمبی پلکیں اور سرخ و سفید رنگ کسی کو بھی دیوانہ بنا سکتا تھا ۔ اور واقعی نوشین کا اندیشہ بالکل ٹھیک نکلا۔ نوید نے کہا۔ "نوشین! میں تم سے بہت پیچھے رہ گیا، تم بہت آگے نکل گئیں۔ میں کوشش کر کے بھی تمہیں کبھی نہیں پا سکتا۔ اس لئے میں نے کائنات کو اپنی کائنات بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ... ٹھیک ہے نا.....؟

نوشین سوائے مسکرانے کے اور کچھ نہ کر سکی صرف اتنا ہی کہہ پائی کہ واقعی کائنات بہت حسین ہے۔

نوشین کی زندگی میں اس دن سے آرزوؤں کے چراغ بجھ گئے اور اس نے اپنے دل میں عزم کر لیا کہ اب مجھے اور اتنا اونچا اٹھنا ہے کہ مجھ تک کسی کے ہاتھ نہ پہنچ سکیں اور اس نے پڑھائی میں اپنے آپ کو ڈبو دیا..... پوری طرح وقف کر دیا۔

کائنات سے نوید کی شادی ہو گئی اور دونوں ایک پرمسرت زندگی گزارنے لگے۔ جس دن نوید کے پہلے لڑکے کی سالگرہ تھی اس دن ہی M.D. کا رزلٹ آیا۔ نوشین نے اس میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی ... کیسے کیسے نشیب و فراز زندگی میں آتے ہیں کہ انسان سے حیرت سے انھیں تکتا رہ جاتا ہے۔ اسی دن نوید کے چھوٹے بھائی فرخ نے نوشین سے کہا۔ "تم مجھ سے شادی کر لو...... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا ...... میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔" یہ سن کر نوشین کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے کیوں کہ فرخ بھی صرف .... صرف میٹرک پاس تھا۔ لیکن اس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ نوشین

سے اظہار عشق سکے۔ اور کہہ سکے کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا..... لیکن جس کی نوشین نے پرستش کی تھی.... عبادت کی تھی.... جس کے لئے اس نے ہزاروں خواب دیکھے تھے جس کے ساتھ رہنے کی اس نے ہزاروں بار اکیلے میں قسمیں کھائی تھیں وہ اس کی دنیا ایک لفظ میں ختم کر گیا۔۔ مٹا گیا اس کی دنیا کو' اس کے خوابوں کو چکنا چور کر گیا..... نوشین فرخ سے کچھ نہیں کہہ سکی سوائے اس کے کہ میں تمہارے لائق نہیں میرے بھائی۔ تمہارا اور میرا رشتہ کچھ اور ہے فرخ.... یہ کہہ کہ وہ پھوٹ پڑی اور آنسوؤں کا سیلاب اس کو بہا کر لے گیا' اور پھر آنسو ہی اس کا مقدر بن گئے..... اس حادثہ کے بعد اس نے نوید کے گھر جانا بھی کم کر دیا اور اپنے آپ کو مریضوں کے لئے وقف کر دیا تھا.... اور سب کچھ بھلا دیا تھا۔

نوید کے ساتھ کچھ عرصہ تو کائنات نے بہت اچھی زندگی گذاری اس کے بعد اس نے اپنا اصل رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ پارٹیوں کی وہ جان تھی' نوجوان لڑکوں سے اسے دوستی رکھنے کا شوق تھا اور گھر کے کسی بھی کام میں اسے دلچسپی نہیں تھی خاص طور سے نوید کو تو وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر جاتی..... نوید کو اس کے حسن سے نفرت ہو گئی' کائنات کی طنز میں ڈوبی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بن کر پڑنے لگی۔ اور پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تو صرف نوشین کا تھا۔ نوشین کے علاوہ اس کا مزاج پہچاننے والا' اس کا دکھ درد سمجھنے والا' اس کے دل کی ہر آواز ہر دھڑکن کو سننے والا کوئی نہیں...... کوئی نہیں.... لیکن اس کا اظہار وہ نوشین سے بھی نہیں کر سکتا تھا.... وقت دبے پاؤں گذر چکا تھا۔ اس لئے وہ خاموش جلتا رہا۔ بھٹکتا رہا کوئی ہم درد' کوئی ہم ساز ہی نہ تھا۔

ادھر کائنات نے اس کے احساسات پر اس طرح ضرب لگائی... کہ وہ تڑپ اٹھا۔ آخر اس کا دل پے در پے ضربوں کو برداشت نہ کر سکا.... ایک دن اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔ کائنات نمائش دیکھنے گئی ہوئی تھی کہ اچانک نوشین وہاں جا پہنچی اور اس کی حالت دیکھ کر اس کا معائنہ کر ڈالا.... پتہ چلا کہ وہ تو اندر ہی اندر بالکل ختم ہو چکا تھا اس کے دل میں جو درد اٹھتا تھا وہ دل کے دورے میں کسی وقت بھی تبدیل ہو سکتا تھا۔ لیکن وقت نکل چکا تھا۔ اب مداوا ممکن نہیں تھا.... نوشین یہ سب دیکھ کر پریشان ہو اٹھی کہ

اچانک نوید نے اپنے ہاتھ میں نوشین کا ہاتھ لے کر ایک لمحے کے لئے اس کی طرف ایسی حسرت بھری نظروں سے دیکھا کہ نوشین کے سارے شکوے گلے ختم ہو گئے اور اس نے دل سے نوید کو معاف کر دیا۔ کیوں کہ اس کی آنکھوں میں جو غم تھا، درد کی جو پرچھائیاں تھیں، معذرت اور ندامت کا جو انداز تھا وہ نوشین کو ایک نیا درد دے گیا۔

چند دن کے اندر ہی نوید دل کا دورہ پڑنے سے ختم ہو گیا مگر نوشین کو ایک ایسے انوکھے درد میں مبتلا کر گیا کہ وہ ڈاکٹر ہو کر بھی اِس کو نہ پہچان سکی. کیا اس درد کی کوئی پہچان ہے؟ کیا درد کے بھی رشتے ہوتے ہیں؟

قصور پھولوں کا

عالم شاہ خاں

" ممی آپ کو نہیں چلنا ہے ؟ "

" کہاں ؟ "

" پاپا کی میرج میں ...... " رینو کا نے سنا اور سکتے میں آگئی۔ ممی کو معلوم تھا کہ شرد نے نیا بیاہ رچایا ہے اور آج ریسپشن ہے ...... مگر اس نیلو کو کس نے بتا جتا دیا یہ سب ! شاید نیلابھ نے ، دونوں ایک ہی اسکول میں جو پڑھتے ہیں۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ چپ

" آپ کو نہیں پتہ ! یہ دیکھو کارڈ ، پاپا نے ہم سب کو بلایا ہے " ننھی نیلو چپی توڑتے ہوئے پھر چہکی۔ " کل ہی تو آیا تھا ڈاک سے ..... آپ نے نہیں دیکھا ؟ "

" دیکھا ..... دیکھ لیا۔

" تو پھر تیار کیوں نہیں ہوتیں ! انکل بھی چلیں گے نا ! "

" نہیں کوئی نہیں جائے گا " ممی سخت تھی ، اکھڑی ہوئی۔

" کیوں آپ نے بھی تو انکل سے نیا بیاہ کیا ہے ، اب پاپا...... "

" نیلو ! چپ بھی رہے گی یا بک بک کئے جائے گی " رینو کا نے نیلو کو جھڑک دیا۔

" میں جاؤں گی .... نیلابھ بھیا اکیلا وہاں موج مارے گا۔ ڈھیر ساری آئس کریم بیلون..... آکاش میں انار پھوٹیں گے ... پھلجھڑیاں نئی نئی .... آپ مجھے تیار کر دو۔

میں رگھو دادا کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

نیلو بولے جارہی تھی اور ممی چپ تھی۔ ایک دم چپ۔ اب نیلو سے رہا نہیں گیا اور وہ کانوں کے پاس جاکر چیخی۔

"ممی! مجھے تیار کردو میں جاؤں گی۔" وہ چونک پڑی جیسے سوتے سے جاگی ہو اور چٹاخ سے ایک طمانچہ جڑ دیا نیلو کے گال پر اور پلو سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہہ دیا نا کوئی نہیں جائے گا۔" ممی گرجی اور نیلو کانپ اٹھی تھی۔

آخر کون سی انہونی ہونے جارہی ہے جو وہ ہتھے سے اکھڑے چلے جارہی ہے۔ کورٹ کچہری کے ذریعے بہ رضا و رغبت رشتۂ ازدواج سے آزاد ہوکر دونوں نے نئی زندگی' اپنی خواہش کی زندگی جینے کی ٹھانی تھی تب۔ اس نے بھی تو آریہ سماج کی بیدی پر سنیت کے ساتھ پہلے ہی لگن کرلیا تھا ڈنکے کی چوٹ ...... اب شرد کسی کو بیاہ لائے تو اسے کیوں اکھرنے لگا... شرد اور اس کے بیچ اب رشتہ ناتا رہ ہی کیا گیا ہے؟ بارہ برس کا ساتھ ... ازدواجی زندگی۔ کڑوی میٹھی یادیں ... گہرے گھنیرے شب و روز اور پھر بچے۔ نیلابھ اور نیلو۔ جب نیلابھ کے گود میں آنے کی امید بندھی تھی' شرد کو لے کر کیسی شرم و حیا سمٹ آئی تھی اس کی آنکھوں میں۔ جسے محسوس کرکے انھوں نے اپنے چھوٹے موٹے سے سبک احساس کے ساتھ اس کی کپکپاتی پلکوں کو ڈھانپ کر چوم چوم لیا تھا... اپنی بے پناہ گہرائیوں سے .... اور اسے اپنی کوکھ میں سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں بارش کی پھوار کی طرح ..... پھر پلکوں کا طلسم ختم ہوا تو سامنے ہلتے ہوئے پالنے میں نیلابھ انگوٹھا چوستا ہوا اسے مسحور کررہا تھا..... وہ تو بیتے ہوئے زمانے کو فراموش کرکے امروز کو سنوار رہی تھی۔ اس میں نئے رنگ بھر کر دیروز کی پرچھائیوں کو آج کے اجالے میں سموکر حیاتِ نو کا پل بنا رہی تھی کہ شرد نے ہی 'ماضی' کو بیدار کردیا اور جیسے پرچھائیاں متشکل ہوئی زندگی میں مجسم ہوکر اس کے ازدواجی معاملات میں بنے ٹھہراؤ کو اس کے احساسات و مدرکات کو مٹا گئیں۔ پھر آگے جو نیا ابھر کر آیا وہ آگ اس کے سامنے ہے۔ جو سامنے ہے وہ اس کا من چاہا ہے۔ اس کی دیرینہ چاہت کا زندہ روپ۔ اس کے پہلے پریم کے خوابوں کی تعبیر' اس کی محبت کے سات رنگوں کی دھنک جب آج اس کے آنچل میں چمکی

ہے، جگمگاتی ہے تو وہ کیوں پھیکی اور بدرنگ ہوئی چلی جارہی ہے۔ واہ رے چنچل من کے بھید! کہیں بھی چین نہیں۔ من کا چین...... سکون وشانتی کو شرد نے ہی تو توڑا تھا۔ اس رنگ راگنی کو شرد ہی نے تو بھنگ کیا تھا جس میں رنج بس کر وہ سب کچھ بھول بیٹھی تھی۔ سُنیت کو، اس کی محبت ومروت کو...... ماضی کو ہی تو جگایا تھا شرد نے..... ان کے کوی نے "سنتی ہو! میری شعرگوئی کو زبان مل گئی آج.... آؤ تو بھلا باہر، دیکھو کون آیا ہے؟" شرد کے لہجہ میں مسرتوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ رینوکا نے سنا تو کندھے سے لگائے نیلابھ کو تھپتھپاتے ہوئے کمرے سے باہر آئی تو اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ایک خاموش کرب کے ساتھ اس کے جسم وجاں کے تار جھنجھنا اٹھے۔ حیرت زدہ سی وہ کہہ گئی۔

"آئیے!"

اس کے سامنے اپنی بھولی بسری الفت کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ وہ اسے ناپسندیدہ کیسے قرار دے سکتی تھی اور تواضع کی کوڑی تو اسے پھینکنی ہی پڑی تھی۔ سامنے کھڑے سنیت نے بھی اس کے احساسات وجذبات کو عزت ووقعت بخشی۔ دل ہی دل اور آنکھوں ہی آنکھوں میں محسوس کر کے اس نے اسے بھی سر آنکھوں پر بٹھایا...... سنیت اور رینوکا۔ خاموشی کی زبان پڑھ کر جیسے ماضی کو بھوگا اور غیر متشکل کو متشکل کر گئے۔

"ارے بھئی! سکتے میں کیوں ہو؟ عزت دو سنیت کو.... مجھ سے پہلے جانتی ہو انھیں تم تو..... ان کی آواز اور تمہارا ساز۔ دھوم تھی دونوں کی۔ کالج میں ان دنوں ان کی آواز اور تمہارا ستار۔ دل آرزومند رہا کہ میرے کلام کو سنیت کی آواز اور تمہارا ساز کاش کہ مل جائے مکتب میں، آج کی طرح معروف کوی نہ ہو کر مخفی شاعر تھا۔ اپنی ڈائریوں میں پوشیدہ اور گمنام......"

"یہیں کھڑے اپنی پوری نظم سنا دیں گے یا اندر کے لئے بھی کچھ چھوڑیں گے....."

"آئیے!" رینوکا نے پرانی پہچان کا لحاظ رکھتے ہوئے سنیت کو احترام دیا۔

"ہاں! ہاں چلئے..... اب تو تروینی سنگم بن گیا یہ ہمارا "کلا بھون"۔ میرا کلام سنیت کی آواز اور تمہارا ساز.... بس لان کے دائیں جانب کا کمرہ سنیت کے لئے ریزرو، وہ

یہیں ریاض کریں گے ..... چاہیں تو رہیں گے ..... خوب گذرے گی جب مل بیٹھیں گے
دیوانے ...... دو نہیں تین ۔" اور آگے یہ دیوانگی ہی تو رنگ لائی ... رنگ کے
وہ دھارے پھوٹے کہ ابھرتی شکلیں مٹ چلیں اور نئے رنگوں سے جیون رنگ گیا سنیت
اور رینو کا ــــــ دھیرے دھیرے ایک نئی تصویر ابھری اور شرد حاشیے پر آگئے تبھی پیدا
ہوئی نیلو۔ اس کے ناک نقش ابھرے تو اپنے پرایے سبھی لوگوں نے ایک لہجہ میں کہا۔ ایک دم
سنیت کا چہرہ مہرہ لیا ہے بٹیا نے تو ...... وہی تیکھے نقوش ...... دل پسند کھلا ہوا چمپئی
رنگ اور کشادہ پیشانی ...... شرد نے بھی سنا، محسوس کیا اور سمجھا۔ "لوگوں کا کیا بکتے
ہیں۔ ہمارا پہلا کیسٹ آیا ہے۔ ناچی کمپنی ہے .... جلتے ہیں۔ سب ..... یہ سب اس تکونٹ تک
بازگمان نے ہوائی اڑائی ہے .... چاہتا ہے کہ ہماری ٹیم ٹوٹ جائے ..... سنیت کو کیسے
کیسے سبز باغ دکھاتا رہتا ہے۔ اس کی آواز کو پانے کے لئے کم جتن کئے اس نے ..... سنیت
بھلا ہم سے کیا ناتا توڑیں گے۔ اس ٹنک بازکوی کی خاطر۔ کبھی نہیں .... اسی لئے تو یہ شوشہ
چھوڑ دیا ...... رینو کا کولے کر، ہوگی شہر میں اچھی طرح رسوائی اور اپنی بن آئے گی۔
لوگ ہیں .... اڑاتے ہیں بے پرکی۔ آدمی کا دل فراخ ہونا چاہیئے۔" شرد نے اپنا دل سے
جوڑے رکھا اور یوں برس بیت گئے 'تینوں کا ساتھ نہ ٹوٹا ... اور پھر نیلا بھ نواں برس
پار کر گیا اور آج نیلو کی ساتویں سال گرہ تھی۔

" کیا تو لائیں آج اپنی نیلو' نہیں نیلم پری کے لئے۔" سنیت انکل نے تب اسے باہوں
میں بھر گہرے بوسے کے ساتھ پوچھا تھا تو وہ چہک کر بولی تھی۔

" ہمالیہ پربت "

" کیا ہمالیہ پربت ! کیا کرو گی بھلا اس کا۔ سنیت انکل کے ساتھ جیسے سبھی متحیر تھے
اس پر ـــ" اس کی چوٹی پر میں ترنگا لہراؤں گی ..... ایورسٹ پر۔"

" پر نیلو رانی ! جھنڈا لہرانے کے لئے تو ایورسٹ پر چڑھنا پڑتا ہے اس کے لئے ریاض
کرنا پڑتا ہے۔"

" جیسے آپ ممی کے ساتھ کرتے ہیں روز روز .... گھنٹوں آپ کے کمرے میں " اس

نے معصومیت سے کہا تھا۔ رینوکا نے شرد کو پلک بھر دیکھا اور نہ جانے کیوں جھینپ سی گئی۔ سنیت بھی تذبذب میں پڑ گیا اور شرد بات کی گہرائی ناپنے سے لگے۔ نیلو پھر چہکی۔

"پر ہمارے ساتھ کون ہمالیہ پر چڑھے گا پاپا یا انکل؟"

"بٹیا رانی! جسے چاہے" پاپا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پاپا.... نہیں پاپا نہیں انکل۔ انکل کے ساتھ ہی تو ممی بھی ہوں گی۔" نیلو کہہ گئی ممی یہ سن کر چکرا گئی۔ انکل نگاہ بچا گئے، اور پاپا کو لگا جیسے وہ پہاڑ سے نیچے لڑھک گئے ہوں۔ تو پھر کہاں جاکر رکے!

روکے رکھنا اب اپنی الفت کے طوفان کو رسم کی ریت سے اور لحاظ کے لبادے لپیٹے رکھنا۔ اپنے اظہر من الشمس عشق کے کھیل کو پوشیدہ طور پر کھیلتے چلے جانا سنیت اور رینوکا کو بھی اذیت دینے لگا۔ اُدھر سب معلوم محسوس کر کے بھی انجان بنے رہنا بھی شرد کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا گیا۔ انھوں نے اکثر تو دیکھا تھا کہ ستار کے ساتھ سنگت کرتی ہوئی رینوکا سنیت کی آواز کی نغمگی میں کہیں کھو جاتی تھی اور جب تان تھرک کر بہتی تھی تب وہ پلک پسار کر اسے بانکی چتون کے ساتھ آنکھوں میں بھر کر پھر پلک موند لیتی تھی۔ سنیت بھی ستار ہی رینوکا کو رجھانے کے لئے راگ الاپتے تھے۔ ستار کے ساتھ ہی جیسے اس کے جسم و جاں کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے تھے اور سامعین مبہوت ہو کر آخر میں مرحبا کہتے تھے۔

"بولے جا رہے ہو پر جادو تو آواز کا ہے۔"

"اور انو ساز کا۔"

"ہاں! ساز اور آواز کا کیا تال میل ہے۔ لگتا ہے جیسے ستار گا رہا ہو اور آواز تال تول رہی ہو۔"

شرد سنتے اور دل ہی دل میں سمٹ کر دونوں کے مقابلے میں خود کو بونا اور ہیچ محسوس کرتے۔ اِدھر جب سے سنیت نے خود غزل کہنا شروع کی تب سے تو ساز اور شر کے رنگ کچھ اور نکھر گئے اور شرد کے لکھے "بول" ہی نہیں وہ خود بھی پھیکے پڑ گئے۔ اب ان کے پُر درد اور الم انگیز کلام کی فرمائش کم ہوگئی۔ سنیت کی رومانی غزلیں جب تب یہاں وہاں اور قریب و

دور گونجنے لگیں۔ ستار چھیڑتی رینوکا سنیت کے نغموں میں جھلکنے لگی۔ ساز اور آواز.......
رینوکا اور سنیت کی سنگت نے وہ اڑان بھری کہ دونوں کی شہرت کو پر لگ گئے۔ آئے دن دور دور سے بلاوے آنے لگے۔ جشنِ موسیقی میں شرکت کے لئے اور دونوں ساتھ ساتھ جانے لگے۔ دو چار دعوت ناموں سے شروعات ہوئی تو اب مہینے میں دس دس دن تک اپنے پروگرام دیتے ہوئے دونوں شہر سے باہر ہی رہنے لگے۔ پیچھے رہ گئے شرد جو نیلو نیلابھ کو سنبھالیں یا پھر گھر دیکھیں۔ ان کی کالج کی لکچررشپ بھی تو گڑبڑا گئی۔ شعر گوئی کند ہو گئی۔ خود غیر متوازن سے ہو گئے۔ یہ گائے اور وہ بجائے اور میں ان کے ساز طنبورے ڈھوؤں۔ انھوں نے سوچا اور طے کر لیا..... یہ سب اب اور آگے نہیں چلے گا اور وہ ان دونوں کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ صاف کہہ دیں گے میرے گوکل میں کھوٹ کی یہ راس لیلا اور آگے نہیں چلنے کی۔ کہیں اور جا کر بسائیں اپنا برندابن۔ شرد غضب ناک ہوئے تبھی گھر کے پھاٹک کے باہر پوں پوں ہارن بجا اور سنیت رینوکا گالوں پر گلاب کی چھائیں لئے مطمئن و مسرور ٹیکسی سے اترے' باہر نکلے۔ بچے اسکول گئے تھے۔ شرد نے انھیں دیکھا اور چپ چاپ اندر ہو گئے۔
" کیا بات ہے ؟ طبیعت ناساز ہے شرد بابو۔" پوچھتے تو سہی بھلا کیسا ہمارا " نغمۂ بہار" پروگرام۔ مانیں گے ایک بار جو میں نے آپ کی غزل چھیڑی تو پھر لوگوں کو کسی اور کا کلام جچا ہی نہیں۔ بس آپ ہی آپ چھائے رہے۔" سنیت سہمی سی آواز میں جھنک بھر ایک سانس میں کہہ گئے۔
" اور ....." شرد کا نیم جاں سا استعجاب تھا۔
" اور آپ کے کلام کی دھن پر انھوں نے وہ ستار بجایا کہ سونے پر سہاگے کی کیفیت طاری ہو گئی محفل میں۔"
" اچھا ہوا یہ کیفیت وہیں تک محدود رہی۔ یہاں تو بوجھ بن جاتی۔"
" آپ کو موسیقی کے بول بوجھ لگنے لگے کب سے ؟" رینوکا نے سادہ لہجہ میں پوچھا۔
" جب سے تمہارے ستار کے تار ڈھیلے ہوئے میرے لئے۔"
" میں سمجھی نہیں !"

" سمجھنے والے سمجھ گئے ہیں !" شرد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
سنیت نے سنا اور وہاں سے ٹل گئے۔ دوسرے لمحے وہ اپنے کمرے میں تھے اور شرد اپنے میں گم۔ رینو کا دونوں کمروں کے درمیان کھڑی جیسے اپنا گھر تلاش کر رہی تھی۔ چپ۔ کوئی اپنے کمرے سے باہر نہیں آیا۔ اسکول سے آنے کے بعد نیلو نیلابھ نے انکل پاپا کے کمروں کے کواڑ کھڑکھڑائے۔ دستک دی مگر خاموشی نہیں ٹوٹی۔ بچوں کو کھلا پلا کر رینو کا بھوکی اپنے بستر پر جا پڑی۔ بچوں نے ماجرا جاننا چاہا مگر وہ بس اتنا کہہ پائی۔
" بہت تھک گئے ہیں ہم۔ سونے دو۔"
صبح دیر تک سوتی رہی رینو کا۔ ابتدائی دسمبر کا سورج ٹھنڈا ہو کر دمکنے لگا تو نیلو نے کندھوں سے جھنجھوڑ کر جگایا۔
" ممی ! انکل کے کمرے کے کواڑ کھلے ہیں ..... انکل نہیں ہیں اور ان کا سوٹ کیس بھی دکھائی نہیں دے رہا۔"
" ممی ! پاپا بھی اپنے کمرے میں نہیں ہیں ! کہاں چلے گئے ؟" نیلابھ نے اطلاع دی
" انکل پاپا دونوں ہی نہ جانے کہاں چلے گئے ؟" رینو کا نے نیلو کی رونی آواز سنی تو ہڑبڑا کر لحاف پھینک گاؤن سنبھالتی ہوئی ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیند کے خمار میں ہی سوچ ابھری۔" جو کل ہونا تھا وہ آج ہی ہو گیا۔"
" بتاتی کیوں نہیں ممی ؟ انکل پاپا کہاں گئے ؟" نیلو نے پھر پوچھا۔
" انکل گئے وہاں جہاں انھیں جانا تھا۔"
" کہاں جانا تھا انھیں' اور پاپا ؟"
" پاپا..... کہاں گئے ؟ نہیں جانتی۔"
" ممی ڈھونڈو نا ! کہاں گئے دونوں ؟"
" میں کسی کو کیوں ڈھونڈوں .... میں تو خود کھو گئی ہوں۔"
" ممی کیسی باتیں کرتی ہو۔ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ آپ کچھ کیوں نہیں کرتیں۔ دونوں چلے گئے اور آپ ! جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔" یہ نیلابھ تھا۔

" ہوا کیوں نہیں! بہت کچھ ہو گیا ہے بیٹے! سب جان جاؤ گے۔ اپنے آپ۔ میں کیا بتاؤں۔" کہنے کو ممی کہہ گئی پھر سنبھل کر بولی۔

" گھبرانے کی بات نہیں۔ انکل پاپا دونوں آجائیں گے چلو! تم اسکول جانے کی تیاری کرو...... میں بھی فارغ ہوتی ہوں پھر تلاش کرتی ہوں دونوں کو۔" یوں دونوں کو بہلا پھسلا کر اسکول بھیج دیا۔ آج ان کے ٹیسٹ جو تھے۔ ٹیسٹ تو رینو کا بھی تھا بڑا مشکل اور جان لیوا ٹیسٹ ...."

" تم ستار بجا رہی ہو اور سنیت تمہیں ......"

" کیا ؟"

" تمہیں گا رہے ہیں سنیت !"

" مجھے گا رہے ہیں وہ کیسے ؟"

" ہاں مرد عورت کو گاتا ہے۔ اسے اپنی آنکھوں پلکوں کے گوشوں میں بھر کر ..... اس کے نقش و نگار کو اپنی آواز میں سمو کر..... اس کے ناز و انداز کو اپنے سُر تال میں جذب کر کے..... اس کے باطنی پوشیدہ پیار کو اپنی چاہت کی راگنی میں ڈھال کر ...."

" شاعری کرنے لگے۔"

" شاعری اور شاعر وہاں کالعدم ہو جاتے ہیں جہاں عاشق و معشوق خود غزل بن کر جینے لگتے ہیں۔"

" آپ یہ تانا بانا کیوں بن رہے ہیں ؟"

" تانا بانا میں نہیں بن رہا۔ تم بن رہی ہو۔ تم ایسا کئے جا رہی ہو ....."

" تو اب ؟"

" اب گھر میں ایک اور گھر بسا کر رہنے کی تمہاری خام خیالی آگے نہیں چلے گی۔"

" سیدھے سیدھے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں تمہارا گھر چھوڑ دوں۔"

" سمجھدار ہو اور سمجھدار کے لئے اشارہ کافی ہے۔"

" وہی سہی! پر نیلابھ اور نیلو ؟"

" جو جس سے بنا ہے ۔ جس کا ہے وہ اس کے پاس رہے گا۔"
" تو.... نیلو ہمارے ...... اور نیلابھ آپ کے ساتھ ...."
" ہاں ! چاہتی ہے تو .... وہی سہی ......"
" پر میں تو دونوں کی ماں ہوں' دونوں کو جنم دینے والی۔"
" لیکن ...... میں تو نہیں دونوں کا..... سنیت بھی نہیں ! لوگ بھی یہی کہتے سنتے ہیں ۔"
" لیکن بچے کیا سوچیں گے ؟"
" یہ تو ماں کو بہت پہلے سوچنا تھا۔ اب تو جو سچ ہے اسے وہ دونوں بھی جان لیں تو بہتر ہے۔ کل بڑے اور ہوشیار ہو کر بہتان اور تہمت برداشت کریں۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ آج سمجھ لیں۔ تو ہے اور اسے مٹانے کے لئے تیاری میں لگ جائیں ۔"
" تو پھر ؟"
" بس یہ گھر آنگن اور نیلابھ کو چھوڑ کر' تو چاہو لے لو یہاں سے ۔ اپنا نیا سنسار بسانے سجانے کے لئے ۔"
اور یوں دونوں کے درمیان علیحدگی کی خلیج بن گئی۔ عدالت کی مہر بھی لگ گئی اور آخر وہ گھڑی بھی آگئی جب دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہہ ہی تو دیا..... جاتے جاتے ایک سفید لفافہ تھما گئی تھی رینو کا ...... گھر کے سائیں سائیں کرتے پُرہول سناٹے میں شرد نے لفافہ کھولا۔ پڑھا :-
.........!
کیا القاب و آداب لکھوں۔ کیسے مخاطب کروں نہیں جانتی۔ کیسی گھڑی ہے کیسے فراموش کر گئی وہ تخاطب جو اپنی مانگ میں سیندور بھرتے ہوئے پہلی بار تمہیں کیا تھا اور دو سال تک اسی تخاطب کو سنجوئے رہی سچی عقیدت مندی سے .... میرے سہاگ .... میری خوش بختی ...... میری مانگ میں جیسے بسے ہو ویسے ہی میری زندگی میں رچے بسے رہو۔ اپنی آب و تاب اور سیندوری چمک کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ اس سیندوری لکیر کو مٹانے

بگاڑنے کے لئے کیا میں اکیلی ہی ذمہ دار رہی۔! ساری کوششیں کیا میری ہی رہیں؟ اپنی کوکھ میں کھلے تمہارے پھول کی مہک میں ڈوبی تھی کہ تمہیں نے کھینچ کر مجھے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر لا کھڑا کیا۔ سنیت کو یہ جانتے ہوئے بھی کہ اپنے کالج کے الہڑ دنوں میں جذباتی طور پر میں اس سے جڑی تھی .... اس لاگ لگاؤ یا ربط وضبط کو میں بھلائے بیٹھی تھی کہ تمہیں شہرت وناموری یا حرص شاعرانہ کی آرزو ہوئی اور تم سنیت کی آواز اور میرے ستار کے سہارے شہرت کی سیڑھیاں چڑھنے کے لئے مجھے اضطراب دے بیٹھے۔ تمہاری نام ونمود کی خواہش اور میری پتنی پریکشا .... یہ کہہ کر میں تمہیں قصوروار قرار دے کر خود کو' جو ہو چکا ہے' اس سے الگ اور بے داغ ثابت کرنا نہیں چاہتی۔ ..... مانتی ہوں کہ میرا خوابیدہ دل بیدار ہو گیا اور ڈھلک ہی گیا سنیت کی طرف .... دو مائلِ عشق دل ہوں اور ساتھ ساتھ ہی کریں سادھنا سنگیت کی۔ ایک راگ چھیڑے اور دوسرا ساز..... تو جب تان ٹوٹے گی، سُر تال میں فرق آئے گا ..... اور یوں میری گود میں آگئی نیلو ...... سنیت کی نیلو۔ اسے تم میری پستی کہو یا میرا پاپ ..... بے خیالی کہو یا میرا زوال ... کچھ بھی نام دو۔ میں اقرارِ جرم کرتی ہوں ..... اب میں نے سب کچھ کھول کر رکھ دیا ہے سامنے ... ویسے کچھ چھپا رہی بھی تو نہیں .... تو پھر اندرونی آگ پر راکھ کا پردہ ڈالے رکھنے میں بھی کیا تک؟ راکھ کی گرمی بھی تو اندر کی آگ کا پتہ دیتی رہتی ہے۔ اب مجھے بھی ڈھکوسلے کی زندگی گوارا نہیں بہت جی لیا فریب اور تصنع میں .... اب آگے اور نہیں ... ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر کے بھی آخر میں یہ سب کیوں لکھ گئی۔ کیا چاہتی ہوں میں تم سے؟ شاید یہی کہ اپنے بیٹے کو اس کی ماں کی بے وفائی کے ساتھ ہی یہ بھی کبھی بتلا دینا کہ اس کے بھولے بسرے جذبۂ الفت کو چاہے آسیبی خلل کہہ لیں اسے' کہیں انجانے میں اس کے پتا نے' تم نے ہی اعزاز دیا تھا"

رینوکا

اور یوں شگاف پیدا ہوا اور خلیج بڑھتی چلی گئی اور ننھی نیلو اور نیلابھ کو سمجھایا گیا دونوں کو کہ یہ سب تھوڑے ہی دنوں کے لئے ہے ... پھر بھائی بہن ایک ساتھ زیادہ رہ بھی تو کیسے پائیں گے۔ نیلابھ کو پلانی جانا پڑے گا اگلے سیشن سے۔ اس کا تو وہاں داخلہ

بھی ہو چکا ہے اور نیلو کو بنستھلی میں پڑھنا ہے ۔ بس یہی سیشن ہے ساتھ ساتھ پڑھ لیں ۔ رہ لیں ایک اسکول میں آگے تو .... ممی نے کہا تو نیلابھ بیچ میں ٹھنک کر بولا

" آگے تو پاپا الگ اور آپ الگ انکل کے ساتھ .... "

" پاپا سے الگ کیوں ... ممی پاپا آپس میں نہیں بولتے .... انکل بھی تو نہیں آتے اس لئے ۔" نیلو نے سمجھدار بنتے ہوئے کہا اور پھر اپنا ننھا ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔

" لاؤ پاپا اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں ' ممی آپ بھی اپنا ہاتھ مجھے دیں ۔ میں ابھی دونوں میں صلح کراتی ہوں .... انکل کو بھی میں منا کر لاؤں گی ۔ " ممی پاپا نے سنا اور سن کر چپ ہو گئے ۔ کسی کے ہاتھ میں حرکت نہ ہوئی تو نیلو گھٹنے میں سر رکھ کر منھ بسورنے لگی ۔ نیلابھ نے اسے باہوں میں بھر لیا ۔ بولا ۔

" روتی کیوں ہے ؟ .... میں تجھے اکیلی نہیں چھوڑوں گا .... تیرے پاس رہوں گا ۔"

" پر بھیا ! ممی ' پاپا اور انکل اب ساتھ ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے .... ممی کو پاپا اچھے نہیں لگتے ' پاپا کو ممی اچھی نہیں لگتیں اور انکل پاپا کو برے لگتے ہیں .... پہلے تو انکل راگ چھیڑتے تھے ' ممی ستار بجاتی تھیں اور پاپا جھوم جھوم کر میری ہتھیلی پر ہولے ہولے تال دیتے تھے ۔ اب کیا ہو گیا ؟ "......

" اب تار ٹوٹ گئے بیٹا ۔! راگ بے سرے ہو گئے اور پاپا بے تال ... پرائے ۔" پاپا کہہ گئے ۔ نیلو کتنا جان سمجھ پائی تھی مگر بولی ۔

" مجھے تو سب اچھے لگتے ہیں ۔ ممی ' انکل ' بھیا اور پاپا بھی ' ممی آپ پھر سب اچھے بن جاؤ نا ! "

" اچھے تو سبھی ہیں بٹیا رانی پر سگے نہیں ۔ " پاپا کہہ گئے تو ممی نے اتھلا دیا ۔

" ہاں بیٹی ! تمہارے پاپا سگے نہیں ! الگ ہیں ۔"

" اور انکل ! "

" انکل تمہارے ہیں اپنے سگے ڈیڈی ۔ ممی کو پاپا سے کہتے میں نے سنا ۔ وہ تو کہتی ہیں کہ میں پاپا کا ہوں اور تم انکل کی ۔ " نیلابھ بولا ۔۔ " اسی لئے ممی تمہیں اپنے ساتھ لے

جارہی ہیں انکل کے یہاں اور مجھے یہاں چھوڑ جائیں گی پاپا کے پاس۔

"مگر ممی تو ہم دونوں کی ہے ...... ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتی۔" نیلو نے آنکھیں چوڑی کرکے کہا۔

" ممی میری بھی ہے پر تمہاری زیادہ میری کم۔"

" وہ کیسے ؟"

" ممی سے پوچھو۔" نیلابھ نے گھورتے ہوئے ممی کو دیکھا تو وہ اندر سے کہیں ٹوٹ گئی اور لپک کر نیلابھ کو اپنی باہوں میں بھر لیا۔ تھوڑی دیر وہ جوں کا توں ممی کے آنسوؤں کو اپنے گالوں پر جھیلتا رہا اور پھر ان کی باہوں کو پرے کرتے ہوئے بولا۔

" جاؤ ممی! گیٹ پر انکل ٹیکسی لئے کھڑے ہیں۔"

نیلو نے سنا تو نیلابھ سے جا کر لپٹ گئی۔ نہ ممی میں طاقت تھی کہ دونوں بھائی بہنوں کو الگ کرے اور نہ پاپا میں سکت تھی کہ کہیں اب جانے بھی دو ...... انکل تو ویسے بھی بیٹھ کٹے کھڑے تھے مگر نیلابھ نے خود اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

" جا... نیلو جا میں آؤں گا تیرے پاس ..... آتا رہوں گا .... روز روز کی کھٹ پٹ سے تو الگاؤ اچھا مگر تجھ سے یہ کبھی نہیں۔"

اب وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ رینو کا شرد کے سامنے سوالیہ نشان بن کر۔ آخر تخم کی غلطی پھل پھولوں کو کیوں اذیت دیتی ہے۔

۱۴ر نومبر۔ چاچا نہرو کی جینتی۔ "یوم اطفال"۔ اسکول میں جشن۔ مقابلۂ نظم خوانی نیلابھ اسٹیج پر مائک کے سامنے اور نیلو چھوٹی لڑکیوں کی قطار میں اسٹیج کے آگے۔ دونوں ایک ہی اسکول میں جو ہیں۔ ابھی نیلابھ نظم سنا رہا ہے۔

پھولوں سے نہیں ہوتا گناہ سرزد
پنکھڑیاں جرم نہیں کرتیں
پھر کیوں مسلے کچلے جاتے ہیں ؟

بچے پھولوں کی مانند
ہوتے ہیں سندر اور معصوم
قصوروار نہیں ہوتی
ان کی پیاری معصومیت
پھر کیوں رلایا جاتا ہے ان کو
خوب ستایا جاتا ہے اس دھرتی پر
کیا خطا ہے ان کی
بتاؤ ! بتاؤ

نیلابھ نظم سنا کر مائک سے دور ہوا تو تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں ڈوب گیا۔ اسٹیج کے نیچے اترا تو نیلو لپک کر اس سے لپٹ گئی۔ مسرت سے بولی۔ "پاپا نے لکھی ہے؟"

"ہاں! بس سنو۔ بچوں کو تو انھوں نے بھی کچلا مسلا ہے۔ نئی ممی لائے ہیں۔ کہتے ہیں "میرے لئے" آج ریسیپشن ہے۔ صبح سے گھر میں دھوم مچی ہے۔ آؤ گی تم۔ دعوت نامہ تو بھیجا ہے پاپا نے ممی انکل کے نام۔ مسز اور مسٹر سنیت کمار!

"آؤں گی۔ میں بھی تو دیکھوں کیسی ہوتی ہے نئی ممی۔ اپنی ممی سے بھی اچھی۔ آؤں گی ممی کے ساتھ۔ ضرور ضرور آؤں گی۔"

"ممی نہیں آئی تو؟"

"تو میں آؤں گی رگھو دادا کے ساتھ.... نہیں تو اکیلے .... ضرور۔" نیلو ایک سانس میں کہہ گئی، تبھی گھنٹی بجی۔

"نہیں تو میں لینے آؤں گا اپنی نیلو کو ضرور۔" نیلابھ نے کہا اور پھر "بائی" کہہ کر الگ ہو گئے۔

"ممی اب تیار بھی ہو جاؤ۔ دیر ہو جائے گی۔" نیلو پھر سنبھلی اور مچل کر بولی۔

"کہا نا! نہیں کہیں نہیں جانا کسی کی شادی میں۔" ممی سخت ہو گئی۔

"کسی کی کیوں پاپا کی شادی ہے۔" بھیا نے کہا تھا نئی ممی آئی ہے۔ ہم دیکھیں گے انھیں کیسی ہوتی ہے نئی ممی؟ آپ سے بھی اچھی گوری؟"

"پاپا سے پوچھنا؟"

"پاپا سے! مگر آپ تو ان کے پاس کہاں جانے دے رہیں؟"

"اپنے پاپا سے پوچھنا۔"

"پر انکل کہاں؟"

"میرا استار بے سُرا ہو گیا تھا اسے ٹھیک کرنے گئے ہیں۔ اب تک تو آجانا چاہئے انھیں؟ ..... کہیں جم گئے ہوں گے یار دوستوں کے ساتھ بیٹھک میں ...... بدلنے گئے ہیں۔"

"کیا بدلنے لگے ممی! انکل؟"

نہیں! تیرا دماغ ...... چل جا اپنی اسٹڈی میں۔ ہمیں نہیں جانا کسی کے یہاں۔ ممی تمتمائی اور تکیہ میں سر ڈال بیڈ پر جا پڑی۔ تب ہی گھڑی نے نو بجے رات کا اشارہ دیا۔ نیلو ممی کے بیڈ روم سے نکل کر اب برآمدے میں آگئی تھی۔ پھاٹک کے دونوں طرف لگے بوگن بلیا کے رنگ برنگے پھولوں میں جگمگاتے جگنو چمک رہے تھے۔ نیلو کا چھوٹا سا دل مسرت سے بھر گیا۔ وہاں شادی میں کتنے تو جگنو ہوں گے۔ رنگ برنگے جگنو۔ پھر چھوٹتی پھلجھڑیاں اور پھوٹتے انار۔ بھیا سب دیکھتا ہوگا۔ مجھے یاد کرتا ہوگا۔ اکیلے یہ سب اسے کیا اچھا لگے گا اور پھر نئی ممی۔ میں اکیلی ہی کیوں نہ نکل جاؤں؟ ممی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ مگر میں ٹھیک ٹھیک راستے بھی تو نہیں جانتی۔ ممی کے اس نئے گھر سے اس اپنے گھر کا راستہ ..... رات الگ ... بھیا نے کہا تھا آنے کو! نہیں آیا اب تک؟ انتظار کرتا ہوگا۔ .... وہ آئے گا ضرور آئے گا ... میں ہی نکلتی ہوں راستے ہی میں مل جائے گا۔"

وہ کچھ سوچ کر برآمدے کی سیڑھیاں اتری تھی کہ گھڑی نے دس بجائے۔ پھاٹک پار کر کے وہ سڑک پر آگئی۔ سونی سڑک پر وہ اس امید میں آگے بڑھی جا رہی تھی کہ بھیا آئے گا۔ آتا ہی ہوگا.... پھر مل جائے گا۔ تبھی لیمپ پوسٹ کے اجالے میں ایک سایہ سا ابھرنے لگا۔

اور وہ چل پڑی۔

" بھیا! بھیا "

نیلو! نیلو میں آگیا۔ چلو بہت دیر ہوگئی ...... نیلو نے سنا اور دوڑ کر نیلابھ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نیلابھ اور نیلو ایک لمبا راستہ طے کر کے اس گھر کے سامنے کھڑے تھے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ کھیلے تھے اور بڑے ہوئے تھے۔ آج وہی گھر انھیں لگا جیسے ان کے لئے پرایا ہوگیا ہے۔ وہ اپنے ہی گھر میں مہمان بن کر آئے ہیں ..... مہمان ہی سہی۔ مگر ایسے مہمان جن کے استقبال کے لئے کوئی موجود نہیں۔

" کس نے میری سدھ لی ؟ " نیلابھ کی فکر بجا تھی۔

دعوت نامہ بھیج کر بلایا پاپا نے بھی پر یہ تک نہیں دیکھا کہ ان کی نیلو بیٹی آئی بھی ہے ؟ اس نے کچھ کھایا بھی .... ایک آئس کریم تک کے لئے پوچھا ؟ " نیلو دل مسوس کر رہ گئی ..... پاپا کتنی کتنی آئس کریم لاتے تھے میرے لئے۔ " آ۔ نیلو آ ادھر گل مہر کے بازو میں ہولیں۔ دیکھیں تو پاپا ہمیں تلاش بھی کرتے ہیں یا نہیں ...... اتنا کہہ کر نیلابھ پھاٹک کے بائیں طرف چھائے اندھیرے میں جا کھڑا ہوا۔ نیلو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

رات اونگھتی ہوئی اجالوں کو اکیلا کرنے لگی تھی۔ مہمان بھی واپس ہوگئے تھے۔ کھانا کھلانے والے بیرے اور خان ساماں بھی مع سامان کے ایک ایک کر کے پھاٹک سے باہر نکل چکے تھے۔ نیلابھ نے پھاٹک سے جھانک کر دیکھا تو حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے نیلو کو بھی اپنے قریب آنے کو کہا۔ " دیکھ! "

اور دونوں نے دیکھا۔ پاپا جگمگ کرتی ہوئی ساڑی اور چمکدار گہنوں سے لدی پھندی نئی ممی کو آغوش میں لئے آہستہ آہستہ اندر چلے گئے۔ اِدھر دیکھا بھی نہیں جیسے انھیں سب کچھ مل گیا ہو اور انھیں اب کسی کی پرواہ نہیں۔ چاہ نہیں .... نیلابھ کی بھی نہیں ... نیلو کی بھی نہیں۔ پچھلے دنوں پاپا کہتے بھی رہے ہیں کہ نیلابھ اب تم بڑے ہوگئے ہو۔ الگ رہنا ...

سونا سیکھو۔ آگے ہاسٹل میں تو اکیلے رہنا ہی ہے۔ اس نے نیلو کو بتایا تو اس نے بھی کہا۔
" ممی بھی مجھے یہی کہتی رہتی ہیں۔ آج تو میری اسٹڈی میں ایک ننھی سی "بیڈ" بھی لگا دی گئی ہے۔"
" نیلو! اب کسی کو ہماری چاہ نہیں ... چنتا نہیں۔ دیکھو نا! پاپا نے پل بھر کے لئے بھی ٹوہ نہیں لی کہ نیلابھ کہاں ہے 'کدھر ہے'۔ لو اب تو دروازہ بھی بند ہوگیا۔"
" ممی بھی اب میری اتنی "کیئر" نہیں کرتی۔ ترت پھرت ربن باندھ بوندھ کر مجھے اسکول روانہ کر دیتی ہے اور انکل کی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتی رہتی ہے۔ دیر تک ..... انکل بھی اب کبھی کبھی ہی کہتے ہیں کہ ہم تو بٹیا کو 'کس' کرنا ہی بھول گئے۔"
" ہاں نیلو! سب ہمیں بھول گئے ہیں۔ اپنی اپنی نئی دنیا میں کھوئے۔ دیکھو تمہیں بھی ڈھونڈنے کوئی نہیں آیا۔ رات اتنی ہو گئی تب بھی نہیں۔"
" ہاں بھیا! اب ہم اکیلے اور پرائے ہو گئے۔ ہمارا کوئی نہیں۔"
" میں جو ہوں تمہارا ... تیرے ساتھ میں ہوں .... اکیلی کیسے؟"
" لیکن تم یہاں پاپا کے پاس' میں وہاں اس گھر میں ممی کے پاس .... پھر آگے تم دور کسی ہاسٹل میں ...... میں کہیں دور تم سے الگ۔"
" تو پھر ہم کیا کریں؟"
" کہیں بھاگ چلیں ہم دونوں ..... دور۔"
" کہاں؟"
" دہلی۔ بمبئی۔ کلکتہ"
" کیسے؟"
" ریل میں بیٹھ کر"
" ٹکٹ .... پیسے ... اور ہمارا وہاں کون؟"
" بچوں کا ٹکٹ نہیں لگتا اور اپنا --- اپنا یہاں بھی کون ہے۔ جیسے یہاں ویسے کہیں اور۔"

"تو پھر چلیں ریلوے اسٹیشن ...... راستہ میں جانتا ہوں۔ کوئی بہت دور بھی نہیں ہے۔"

دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے سونی سڑک پر چل پڑے تھکے اور اداس قدموں سے۔ سڑک پر روشنی بکھری تھی۔ لاوارث روشنی انھیں کی طرح۔ پرچھائیں کسی کی نہیں ابھری۔ بس جیسے دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کی پرچھائیاں ہوں تبھی ایک موٹر سائیکل پھٹ پھٹاتی ہوئی ان کے قریب سے گذری اور وہ ٹھٹھک کر رہ گئے سناٹا پھر بحال ہوگیا اور ان سے لپٹ گیا۔ اب کی بار تو وہ کپکپا گئے۔ سامنے بچھی پٹریوں پر سے ٹرین جھنگھاڑتی ہوئی نکلی تو ان کے پیر اکھڑ گئے اور وہ فٹ پاتھ پر جا چڑھے۔

" بھیا! ریل تو دھرتی کو ہلا دیتی ہے۔ رات ہے' ریل سے ڈر لگتا ہے اور پھر ٹکٹ"

" تو لوٹ چلیں ! ممی پاپا کے پاس۔"

"

ہاں !"

" پہلے کہیں چلنے کو کیوں کہا تھا ؟"

" تمہیں ڈر نہیں لگتا ؟"

" لگتا ہے... مجھے تو ممی پاپا سے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔"

" ممی پاپا سے بہت ڈر لگتا ہے کیوں ؟"

" بہانے بنا کر ہمیں بانٹ لیا' تم ممی کے پاس اُدھر میں پاپا کے پاس اِدھر"

" کیوں ؟"

" تمہیں نہیں معلوم ! ممی کہتی ہیں میری صورت انکل سے ملتی ہے اور تمہاری پاپا سے اس لئے تم پاپا کے پاس اور میں، انکل کے یہاں"

" تو اس میں ہمارا کیا قصور ؟"

" بھیا ! دیکھو سامنے بڑی پھاٹک کے اوپر کیا لکھا ہے ؟"

" پولیس اسٹیشن "

" تو چلو! وہیں چلتے ہیں"

"مجرموں کو پولس جیل میں ڈال دیتی ہے۔ ہم بھی مجرم ہیں قصوروار ہیں۔"

"ہم مجرم ہیں!"

"تمہیں پاپا کی نظم نہیں یاد.... وہی نظم جو تم نے یوم اطفال پر پڑھی تھی۔"

"ہاں پڑھی تھی! یاد بھی ہے کیوں؟"

"ہمیں ساتھ رہنا ہے۔ جیل میں ساتھ رہیں یا کہیں بھی۔" نیلو نے سمجھدار بنتے ہوئے نیلابھ سے سرگوشی میں کچھ اور بھی کہا تو ہاں میں ہاں ملا کر نیلابھ بھی کہہ گیا۔

"گاندھی بابا اور چاچا نہرو بھی تو رہے تھے جیل میں۔"

اور وہ ایک مضبوط ارادے کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

پولس اسٹیشن کا بڑا اور کڑا پھاٹک بند تھا۔ ہاں اس کی کھڑکی کھلی تھی۔ دونوں اس کے سامنے کھڑے تھے۔ نیلابھ نے نیلو کا ہاتھ تھام لیا۔

"جب دل میں ٹھان ہی لی تو چل' ڈرنا کیسا؟" لڑکا ہونے کی اینٹھ میں کہنے کو وہ کہہ تو گیا مگر اس کے پیر کپکپا اٹھے۔

"ڈر کیسا؟ ہم تو اپنا قصور! اپنا جرم قبول کرنے آئے ہیں کچھ دبانے چھپانے نہیں۔"

"تو پھر اندر چلیں!"

"کیوں نہیں جو ٹھانی ہے وہ کرنا ہے۔"

اتنا کہہ کر ننھی نیلو بنا جھکے کھڑے ہی کھڑے کھڑکی سے گذر گئی۔ اب تو نیلابھ بھی پیچھے رہنے والا نہیں تھا۔ وہ بھی کھڑکی پھاند کر دروازے کے اندر نیلو کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"کون ہے؟" ایک سخت اور بھیانک سوال گونج اٹھا۔

"ہم نیلو اور نیلابھ۔" نیلو میں جانے کہاں سے ہمت آگئی اور نیلابھ کا ہاتھ پکڑے مسلح سنتری کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"تم لوگ.... بچے! اکیلے رات میں یہاں ... کیا چاہتے ہو؟" اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتائیں اندر سے ایک بارعب آواز آئی۔

"کون ہے؟ اس ٹائم اندر بھیجو" اب تو وہ دونوں خوف زدہ ہو گئے۔ رات ٹھٹھر نے

لگی تھی پھر بھی دونوں کا پسینہ چھوٹ گیا۔ نیلو نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"سنتری جی! اچھا رہنے دو ابھی۔ ہم صبح آجائیں گے۔" نیلابھ بھی ڈر کر ٹھٹھک گیا۔

"سنتری! اندر کیوں نہیں بھیجتے؟ کون ہے؟ .... اب کی بار لہجہ میں گھن گرج تھی۔

"اب چلو! جو کہنا ہے تھانیدار صاحب سے کہنا۔" اتنا کہہ کر سنتری نیلابھ کا بازو پکڑ اندر لے چلا۔ نیلو بھی پیچھے پیچھے ہو گئی۔

"ارے ان بچوں کو کیوں دبوچ لیا؟ کون ہے ان کے ساتھ۔" تھانیدار نے انھیں سامنے دیکھا تو تعجب سے کھڑا ہو گیا۔ اپنی بیلٹ ٹھیک کرتے ہوئے وہ گھر جانے کی تیاری میں تھا۔

"صاحب! اور کوئی نہیں ان کے ساتھ۔ یہ دونوں ہی ہیں!" سنتری نے بتلایا۔

"کیا؟" تھانیدار حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"بولو! بچو! اتنی رات گئے کیوں آئے ہو یہاں؟"

"کہو نا! نیلو کہتی کیوں نہیں؟" تھوڑی دیر وہ دونوں کھڑے رہے۔ چپ خاموش۔ پھر نیلو اٹک اٹک کر بولی۔

"ہمیں جیل بھیج دو پولس انکل۔ ہم دونوں بھائی بہن ساتھ ساتھ رہیں گے جیل میں۔" یہ سن کر تھانیدار سکتے میں آگیا بولا۔ "جیل بھیج دیں تمہیں کیوں بھلا؟ کون سا جرم کیا ہے تم دونوں نے ..... ؟"

"جرم .... ہاں جرم کیا ہے ہم نے ... نیلو بتا دے ... نیلابھ چاہتے ہوئے بھی آگے نہ بول سکا۔

"ہم نے اس دھرتی پر جنم لیا ہے یہی جرم ہے ہمارا ..... ہم بچوں کا"

نیلو اب بے خوف ہو گئی تھی اور تھانیدار کو یہ سن کر ایسا لگا جیسے کسی نے گولی داغ دی ہو .....

میں دیکھتا ہی رہ گیا

عبدالمجید خاں

چھن، چھن، چھن، ٹھن، ٹھن، ٹھن، گھڑ، گھڑ، گھڑ ....

اور پھر مسلسل خالی برتنوں کی گھن گرج نے میری نیند اُڑا دی۔ میں سوچنے لگا کہ "ہے بھگوان یہ گھر ہے یا کویت، اور کہیں بُش کی رُوح تو ہماری شریمتی جی کے ہاتھوں میں حلول نہیں ہو گئی ہے۔" میری یہ حالت کہ بدن کی نس نس ٹوٹ رہی تھی۔ رات کے ایک بجے تک ٹائپ رائٹر سے انگلیاں نہ اٹھ سکی تھیں اور نہ ہی ایک لمحے کے لئے آنکھ ہی جھپکی تھی۔ آج اتوار تھا، سوچا تھا مسلسل کئی دن کی تکان دن بھر سو کر اُتاروں گا۔ جب انسان مجبور ہوتا ہے تو حسّاس اور ذی روح ہوتے ہوئے بھی بے حس و بے جان کھلونا سا بن کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ روپیوں کی کھن کھن اس کو اپنی ہر جھنکار پر تگنی کا ناچ نچوا ڈالتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی اس مسلسل اوور ٹائم سے ہو رہی تھی۔ ابھی میں پوری طرح خیالوں کے جال سے آزاد بھی نہیں ہوا تھا کہ کچن سے پھر آوازیں آنے لگیں۔

"ارے میں کیا کروں؟ مجھے کیوں پریشان کر رکھا ہے؟ اپنے چہیتے پاپا سے نہیں کہتی۔ ٹیچر تو لگائے گی ہی۔ جب پچھلے مہینے بھی ٹیوشن فیس نہیں دی اور یہ مہینہ بھی پورا ہو گیا۔" .....

"اب تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟ لے یہ چائے کا پیالہ ... اگر وہ اُٹھ گئے ہوں تو انھیں دے آ۔"

پھر شیام کی بڑبڑاہٹ کانوں سے ٹکرائی۔
"حما تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ ارے نئے کپڑے نہ سہی۔ اس پرانے شرٹ میں تو بٹنے ٹانک دیا ہوتا۔ تاکہ غریبی کے ساتھ ساتھ پھوہڑپن کا تو لوگ مذاق نہیں اڑاتے۔"
میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آنکھ اور کان بند کرلئے۔ اسی وقفہ میں میری شیلا آئی اور چائے کا پیالہ ٹیبل پر رکھا اور بے اختیار اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔
"اوہ پاپا جی اٹھئے نا۔ چائے ٹھنڈی ہورہی ہے۔ ارے یہ آپ کا بدن کیوں انگارے کی طرح دہک رہا ہے؟ نا بھئی نا۔ آپ اتنا ہارڈ ورک نہ کیا کیجئے۔ اور ہاں آپ نے دوائیاں لینا بھی تو چھوڑ دیا ہے نا۔"
مجھے اس کی معصومیت پر ہنسی آگئی اور میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کیا خوب وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔"
کسی کو ٹیوشن فیس چاہئے، کسی کو سوٹ کی ضرورت ہے اور اس خالی برتنوں کی گڑگڑاہٹ سنوانے کا تمہاری ماں کا مطلب؟
ہے رام! میری پناہ۔ یہ شور وغل تو بڑے سے بڑے مزدوروں کے ایجی ٹیوشن میں بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ اب دیر رات تک میں یہ اوور ٹائم نہ کروں تو پھر کیا کروں؟ بولو بیٹے۔ تم تو بڑی انٹیلی جنٹ ہونا۔ کردو ہماری پروبلم بھی حل۔"
"اے سنو یہ کیا حل کرے گی؟ میں بتاتی ہوں اس میں قصور کس کا ہے؟ جب دنیا میں رہتے ہو تو دنیاداری تو نبھانی ہی ہوگی۔ دھیان دو۔
"....... وہ سامنے دیکھ رہے ہو۔ نیا پلاٹ، وہ ہیرو ہونڈا، یہ بچوں کے نئے نئے سوٹ۔ یہ سب اتنی سی تنخواہ میں کیسے آگئے؟ ماتھر بھی تو آپ کا ہی سبورڈی نیٹ ہے۔ اور آپ تو آفس سپرنٹینڈنٹ ہیں۔"
...... اجی سپرنٹینڈنٹ صاحب مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ شاید وہ مرے گا بھی تو اس کی چتا چندن کی لکڑیوں سے سلگے گی اور بھگوان نہ کرے آپ .....

..... اجی اور آپ کے کاغذی اصولوں کی تو اتنی ردّی تک بھی نہیں ہے جن سے چِتا پھونکنا تو دور رہا، گھر کا چولہا ــ بھی نہیں جلایا جاسکتا۔"

اور رام جانے شریمتی جی کتنے بھاشنوں کے دھواں دھار بے موسم کالے کالے بادل برساتی رہیں۔ میں کوئی جواب دیئے بنا بستر چھوڑ کر اٹھا اور جب تیار ہوکر جانا چاہتا تھا تو وہ بالکل میرے قریب آئیں۔ بڑی لگاوٹ سے دیکھا۔ ایک بے جان سے مصنوعی ہنسی کی لپ اسٹک اپنے ہونٹوں پر سجائی اور کہنے لگیں۔

"اے جی! سنتے ہو۔ مانا کہ آپ دھرت راشٹر، راجہ ہریش چندر، ساکشات گاندھی مہاتما ہو۔ میری اور اپنی تو زندگی چڑھا دی اصولوں کی بھینٹ، پر بھگوان کے لئے اب ان بچوں کے بھوشیہ کے لئے کچھ تو سوچو۔"

"ارے تم بولتے کیوں نہیں؟ میں ہی میں بولے جا رہی ہوں۔" میں خاموش رہا شریمتی جی نے پھر جھنجھلا کر کہا۔ "کچھ سُن بھی رہے ہو۔"

"دیوی جی پچھلے پچیس[۲۵] سالوں سے ہی سنتا آرہا ہوں اور اب بھی کہتی رہیئے سنتا رہوں گا اور معاف کرنا اب تو یہ ٹیپ ریکارڈر کا کیسٹ بھی گھستے گھستے ......" پھر کیا تھا کوئی بجلی کا کرنٹ تھا جو شریمتی جی کے لگا اور وہ بے اختیار کھڑی ہوکر اپنی بوسیدہ ساڑھی کے پلّو کو بے ضرورت بل پہ بل دینے لگیں اور بار بار مجھے قہر آلود نظروں سے بھی دیکھنے لگیں۔ پھر بڑے جذباتی لہجے میں بولیں۔

"تم پر تو نہیں، رحم تو شیام پر آتا ہے مجھے اپنے شیام پر۔ جو فرسٹ ڈویژن سے بی۔ ایس۔ سی۔ ہوکر بھی دو سال سے نو ویکینسی کے ناگ سے اپنے آپ کو ڈسوا رہا ہے۔"

...... کل اشوک بھائی صاحب آئے تھے۔ شیام بھی یہیں تھا۔ اس سے کہہ رہے تھے۔ کیا بتائیں بیٹے اگر تیرا باپ چاہے تو تو کل کی تاریخ میں نوکر ہوسکتا ہے۔"

میں نے شریمتی جی کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

فرمانے لگیں۔ "سُنا ہے کہ آج کل یہاں ایمپلائمنٹ آفیسر کوئی مس بیلا آئی ہوئی ہیں جو آپ کی چہیتی کلاس فیلو رہ چکی ہیں۔ کسی آفیسر کی یہ طاقت نہیں کہ ان کے بھیجے ہوئے

میرٹ نمبر اور سفارش کو رِجیکٹ کر سکے۔
.... ارے بھئی چلیے بھی جائیے نا' کروا دیجئے ان سے ایک فون......
بھائی صاحب کہہ رہے تھے کہ ان کے آفس میں ہی ایک اسٹینو کی جگہ خالی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ کام ضرور ہو جائے گا۔ اور بھگوان جانے بھائی صاحب تو ان کے اور آپ کے بہت قریبی مراسم کے نہ جانے کتنے اور کیا کیا قصے سنا رہے تھے۔ "کیوں جی پرانی شراب اور بچپن کی دوستی کیا ایک جیسی نہیں ہوتی۔" وہ نشہ ہی کیا اور ہوتا ہے اور یہ بے نام رشتے کی پاس داری بھی کچھ اور ہی نشہ رکھتی ہے۔"؟
میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے شریمتی جی کو دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے آج ماضی کے ستار کے اُن تاروں پر ہاتھ رکھ دیا تھا جہاں سے نغمے نہیں دھڑکنیں پھوٹتی ہیں سے نالہ کناں ہو جاتی ہیں۔
میں نے کہا۔ " دیکھو! تمہارے بھائی صاحب اشوک کو تو باتوں میں کچھ نمک مرچ لگانے کا شوق نہیں' مرض ہے۔ ٹھیک ہے بیلا نے میرے ساتھ پڑھا ہے۔ آج اس بات کو پچیس ۲۵ سال کا وقفہ ہو چکا ہے۔ کیا بھروسہ! وہ مجھے پہچان بھی سکے گی یا نہیں۔
"رہی بات پرانی شراب کی تو نہ میں نے کبھی ایسی کوئی شراب پی اور نہ اس کے مزے سے ہی واقف ہوں۔ تم تو جانتی ہو پھر کیوں واہی تباہی بکتی ہو۔"
" اجی جانتی ہوں میں تمہیں بھی اور تمہاری پاکبازی کو بھی۔ اپنی شرافت کا گاؤن تو اپنے پاس ہی رکھیے اور یہ بھی سُن لیجئے کہ مجھے شادی سے پہلے کی تمہاری ڈائری پڑھنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی میں تو میرے شیام کی سروس چاہتی ہوں اس کو اس کی ضرورت ہے۔ تمہیں بھی اپنے لئے مالی سہارا چاہئے اور بنا پیسے کے تو مجھ سے بھی گھر گرہستی کے توڑ جوڑ روز روز نہیں ہوتے ....."
اور میں بات پوری ہونے سے پہلے ہی گھر سے باہر نکل آیا اور بے اختیار میرے قدم بیلا کے بنگلے کی طرف اٹھ گئے مگر ایک انجان کرب سے میں تڑپ اٹھا جس کے بیان کے لئے کوئی الفاظ نہیں۔ عجیب اتفاق تھا کہ سڑک پر سے جو ماروتی گزری

اس میں بیلا ہی بیٹھی تھی۔ حالانکہ میری اور اس کی نظر چار نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی میں نے اس کو دیکھ لیا تھا۔ اس وقت بھی بیلا نے سفید بے داغ ساڑی پہن رکھی تھی اس کی زلفیں چاندی کے تاروں کی طرح سفید ہو کر مستانہ وار اڑ رہی تھیں۔ شوخ ہرنی جیسی اس کی نیلی نیلی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ ایسا لگ رہا تھا جیسے چاند کے ہالے سے سورج کی کرنیں پھوٹ نکلی ہوں۔

اُف !! یہ وہی کالج کی شوخ رنگین تتلی ہے۔ نہیں نہیں یہ تو یونان کی کسی دیوی کا مرمریں مجسمہ ہے اس کی ماروتی تو چلی گئی مگر میرے لئے یادوں کا سیاہ پوش دھواں سے چھوڑ گئی۔ ایک ایک بات' ایک ایک ملاقات' ایک ایک یاد۔ نہ جانے کتنے ہرے زخموں کو سُرخ گلاب بنا گئی۔

میں سوچ رہا تھا۔ "کیا میں بیلا کے بنگلے تک جاؤں' یہ کہنے کے لئے کہ میں تم سے اپنے بیٹے کی نوکری کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔"

میں نے وہ سارے وعدے' وہ ساری قسمیں' وہ سارے عہد توڑ ڈالے جن کو میں نے اور تم نے ایک ساتھ سنجویا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ اگر شادی کے بندھن میں بندھیں گے تو ہم تم' ورنہ ایک ساتھ موت کی آغوش میں سو جائیں گے۔ بیلا کتنی عظیم ہے۔ شباب کے پچھلے پہر تک اپنے وعدے پر قائم ہے۔ کیا سماج نے اس پر اپنی دو دھاری رسموں کی کٹار نہیں چلائی ہوگی۔ مگر اس نے اپنے جسم کے تاج محل میں ان سب وعدوں کا مزار آج بھی بنا رکھا ہے۔ اور ایک میں کہ حالات کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ہوا کے ایک جھونکے ہی سے میں خزاں کے زرد پتے کی طرح اُڑ گیا۔ مانا کہ میری شادی ماں کی آخری آرزو' باپ کے وقار کا طنطنہ اور حالات کے دھارے کا پُر زور تقاضہ تھا۔ مگر ان سب سے تو محبت کی تصویر کے خدوخال میں رنگ بھرنا ہی ہوتا ہے۔ اور عشق تو آگ کا دریا ہے جس کو کود کر ہی پار کرنا پڑتا ہے۔ تب تک میرے قدم سست پڑ کر' پھر تیز سے تیز تر ہو گئے۔ جذباتِ محبت نے جسم کو پھونک ڈالا۔ میں سب کچھ ہی تو بھول گیا۔ اپنے اصول' شریمتی جی کی بیزار تھنا" شیام اور شیلا کا مستقبل اور اپنی بزرگانہ حیثیت۔ بس میں تو کھنچا جا رہا تھا۔ اس قدر

گرم جوشی و جنون کے ساتھ کہ مجھے اشوک کے پیچھے سے پکارے جانے کا ہوش بھی نہیں رہا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں سے نکلا

یقیناً اس وقت میرا اشک ندامت سو فیصدی اس پوشیدہ قطرے کی طرح طوفانی تھا۔ میں... بیلا... کے دامن سے بغیر کچھ کہے' کچھ سنے' لپٹ کر اتنا رونا چاہتا تھا کہ میرا وجود انھیں اشکوں کے قطروں میں تحلول ہو کر رہ جائے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں کہ میری اس کشمکش میں کب بیلا کے بنگلے کا پھاٹک آگیا اور میں بخار کی ناتوانی' شدید جذبات کی فراوانی سے کب بے ہوش ہو کر ٹھیک اس کے پھاٹک میں سجدہ ریز ہو گیا۔ دو دن کی نیم بے ہوشی کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں یہ منظر دیکھ کر مبہوت تھا کہ بیلا کے منہ میں شریمتی جی اپنے ہاتھوں سے اور شریمتی جی کے منہ میں بیلا اپنے ہاتھوں سے رس گلے کھلا رہی ہیں۔ ادھر میری ٹیبل پر نسخہ نہیں شیام کا اپائنٹ منٹ لیٹر پڑا ہے۔ دور کھڑے اشوک بھائی صاحب دبی دبی ہنسی ہنس رہے ہیں .....

اور پھر میری ملتجی نظر بیلا کی اس برق بار نظر سے ٹکرائی جس نے نشتر جراحت بن کر میری آنکھ کے پچیس سال پرانے جذب شدہ قطرۂ اشک کو کھینچ نکالا تھا۔ یہ اس کی ہی چبھن تھی جس نے آج تک مجھے کرب کی صلیب پر چڑھا رکھا تھا۔ بیلا میری بیلا' میری مسیحا' میری حاصلِ زندگی۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر چپ چاپ چلی بھی گئی اور میں اُسے بس خالی خالی نظروں سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ دیکھتا ہی رہ گیا۔

مقتول کون ؟

عزیز اللہ شیرانی

فضا گرد آلود تھی۔ کہیں ماحول میں خاموشی اور سنّاٹا تھا، کہیں خوف و ہراس کے بادل منڈلا رہے تھے۔ بادلوں کی گرجن دلوں کو دہلا رہی تھی۔ مارے خوف کے آوازیں نہیں نکل رہی تھیں۔ خونی پنجے پرندوں کو جکڑ کر بے دم کر رہے تھے اور کمزور پرندے اپنے آپ کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ آسمانی ہوائیں تیز ہو رہی تھیں۔ زمین کا نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ مسجدوں سے اذانیں بھی سنائی نہیں پڑ رہی تھیں۔ اور مندروں کی گھنٹیاں مدھم ہو گئی تھیں۔ زمین پر چیل کوؤں کی چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔ سب لوگ خوشگوار موسم کی امید کر رہے تھے۔ وہ آسمانی رحم کی بارش کے منتظر تھے۔ وہ اپنے مسلک و عقیدت سے نئی اور پُر سکون زندگی کے لئے ہاتھوں کو اُوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ گھروں میں محصور ہو کر امن و خیر کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اچانک ایک دھماکے کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔ انھوں نے اپنے مکانوں کے روشن دانوں سے باہر دیکھا۔ کچھ ہی دور ایک بم کے دھماکے سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے جس میں انسانی جسم جل رہے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر لکشمن بہت بھاوک ہو گیا۔ اس نے اپنی پتنی سے کہا۔ دیکھو گیتا! یہ اپنے رحیم بھائی اور رامو کا مکان ہے نا؟...... بیچارہ رحیم کتنا غریب تھا۔ کتنا نیک انسان تھا۔ اور رامو، وہ تو بس محبت کا پجاری تھا۔ ان غریبوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ مگر اُن بھیڑیوں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔

گیتا نے بڑی بے توجہی سے کہا۔ "چلو کھانا کھا لو۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" مگر لکشمن کو بس ایک ہی دُھن تھی۔ اُس نے تو وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب مختلف عقیدوں اور فرقوں کے لوگ گلے ملتے تھے۔ لیکن اب انسانی جسموں کو آگ میں جھونکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وقتی گردشوں کی شدّت سے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس کی روح اُن مقتول لاشوں کا راز معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی روح وقت اور حالات سے یہ سوال کر رہی تھی ....

عقیدت و احترام سے روزہ کشائی کا اہتمام کرنے والے' عید کی سوئیاں سے لطف اندوز ہونے والے' دیوالی کی روشنی میں مہتاب کی کرنیں بکھیرنے والے' دشہرے کے میلوں میں مسرتیں بانٹنے والے' گوتم کی گونج اور مہاویر کی وانی سننے والے' کرسمس پر روشن ستاروں میں مقدس نور تلاش کرنے والے' گروگرنتھ صاحب کو سننے والے آج نظروں سے کیوں اوجھل ہوتے جا رہے ہیں؟....

اپنی روح کی آواز سُن کر اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ اپنی پتنی سے کہہ رہا تھا "گیتا! ہم نے بہت سی دیوالیاں اور عیدیں دیکھی ہیں مگر آج سب کچھ ختم ہو گیا۔"

لکشمن کی باتیں سُن کر گیتا منہ بناتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ اسے بھلا کیا لینا دینا ایسی باتوں سے۔ اسے تو بس اپنے گھر کی دیکھ بھال سے کام تھا۔ لیکن لکشمن گھر سے باہر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ تو باہر آکر زور زور سے چلانا چاہتا تھا۔ لیکن وقت کی پابندی نے اس کی زبان روک دی تھی اس کے باوجود اُس کی اندرونی کشمکش سے نئی ذہنی تخلیق جنم لے رہی تھی۔ جس میں سیکڑوں چیختی چلاتی آوازوں کا ہجوم تھا۔ ہزاروں دھڑکنوں کی تیز رفتاری تھی۔ زمین پھٹ رہی تھی جاندار اس میں غرق ہو رہے تھے۔ لکشمن کی آواز بھی جوالامکھی کی طرح پھٹ پڑنا چاہتی تھی وہ حصار کو توڑنے کے لئے گھر سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے اپنی بے بسی پر حیرت ہو رہی تھی۔ یہی خاندانی مکان جس کی حد بندی میں اس نے خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ لیکن آج اسے اس حصار سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب وہ اس مکان کی عمارت بنانے کے لئے ڈلا چمار کے کنویں سے پانی لایا تھا۔ شاہی قلعے کی ریت سے اُس نے دیواروں کی نیو رکھی تھی۔ محلّے کے بڑے بوڑھوں نے نیو کا پہلا پتھر رکھا تھا۔ سب نے

لکشمن کی کڑی محنت کی تعریفیں کی تھیں۔ اس نے اپنے شکستہ گھر کو بنایا تھا۔ اپنے پوروجوں کا نام اونچا کیا تھا۔ پتا کے مرنے کے بعد اپنے پریوار کی سرپرستی کی تھی۔ انھیں ایک گٹھے کی طرح باندھ کے رکھا تھا۔ آج وہ حصار کو توڑنا چاہتا تھا۔ اس ارادے سے جب وہ گھر سے باہر نکلنے لگا تو اس کی پتنی نے انکساری سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "یہ آپ کہاں سے جا رہے ہیں۔؟"

گیتا کی آواز سُن کر گھر کے دیگر افراد بھی اپنے اپنے کمروں سے آنگن میں نکل آئے۔ منجھلے نے کہا "بڑے بھیاّ یہ تم کیا کر رہے ہو؟" بوڑھی ماں اپنی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بولی "کیا پاگل ہوا ہے؟ ... باہر پولیس ہی پولیس ہو رہی ہے۔ تو کہاں جا رہا ہے لکشمن رُک جا۔ وہ تجھے پکڑ لیں گے۔" لیکن لکشمن اندرونی قید سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بوڑھی ماں سے کہا۔ "میں اب نہیں رکوں گا۔ میرے اندر ستیہ جیوتی پرکٹ ہو چکی ہے۔ میرے اندر آتما کی آواز نے نیا جنم لے لیا ہے۔ میں اب نہیں رکوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے دل کی جیوتی کو پھیلانے کا ارادہ لے کر گھر سے باہر آگیا۔ سڑک سنسان تھی۔ اسی لمحہ اس نے قدموں کی چاپ سُنی۔ وہ سہم سا گیا۔ چند سپاہی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لکشمن انھیں دیکھ کر واپس گھر میں لوٹ گیا اسے گھر میں آتا ہوا دیکھ کر بوڑھی ماں نے مالک کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ لکشمن اپنے کمرے میں گیا تو اسے گیتا کے رونے کی آواز آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ اپنے سوآمی کے لئے.......

گیتا! لکشمن نے زوردار آواز میں کہا۔ "رونا انسان کی کمزوری ہے۔ تم مجھے کمزور نہ بناؤ۔" لیکن گیتا کی ایک ہی رٹ تھی۔ "اب آپ سوگند کھاؤ کہ باہر نہیں جاؤ گے۔ ایسے میں کچھ ہوگیا تو؟...." لکشمن نے گیتا کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اتنے میں پاس والے مکان سے عورتوں کی چیخوں نے اُسے پھر سے متزلزل کر دیا۔ اس میں دوبارہ گرمی اور جوش پیدا ہوگیا۔ اس نے فوراً اپنے کمرے کی دیوار سے اینٹیں ہٹائیں اور پڑوس کے مکان میں داخل ہوگیا۔ عورتیں اور بچے زور زور سے رو رہے تھے۔ سامنے پولس کی جیپ میں راجو کی لاش تھی۔ راجو اس کا دوست تھا۔ اس کا یار تھا۔ وہ درندوں کی گولی کا نشانہ بنا

تھا۔ اور پولس اپنی نگرانی میں انتم کریا کرم کے لئے اسے لے جا رہی تھی۔ لکشمن بھی پولس کے ساتھ شمشان گھاٹ تک چلا گیا۔ راستے بھر اُس کے دل میں یہ خیال گھومتا رہا کہ راجو کا قتل اُس کا اپنا قتل ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اسے اس کی کھوج کرنی چاہیئے۔ اسی فکر میں جلدی جلدی کریا کرم کر کے اُسکے گھر تک پہنچنے کے لئے کرفیو پاس سے حاصل کر لیا۔ اب اسے گھومنے کے لئے چھٹکارا مل چکا تھا۔ وہ اپنی اس کامیابی پر بہت خوش تھا۔ وہ دن بھر گھومتا رہا۔ شہر کے کئی محلّوں سے گزرا۔ اس نے دیکھا وہاں کوئی کرفیو نہیں ہے لیکن حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ افواہوں کا بازار گرم ہے۔ نشستیں ہو رہی ہیں۔ دیواروں پر رنگ برنگے نعرے لکھے ہوئے ہیں۔ نعروں کا زہر قطرے سے سمندر کا روپ اختیار کر چکا ہے۔ ایک جھنڈ کو اس نے ساکشات نعرے لگاتے ہوئے دیکھا۔ ان کا جوش آسمانوں کو للکار رہا تھا۔ اشتعال انگیز نعرے سننے کے بعد وہ آنے والے وقت کی فکر کرنے لگا تھا۔ ایک عظیم مفکّر کی طرح .... ایک اوتار کی طرح .....

"کہیں یہ نعرے ہزاروں اور کروڑوں انسانوں میں نہ پھیل جائیں .... پھر تو اندھکار ہی اندھکار ہو جائے گا۔ جیون لیلا خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ نعرے کہیں کمپیوٹر نہ بن جائیں کمپیوٹر جو کبھی غلط نہیں ہوتے لیکن غلط ہاتھ انھیں غلط بنا دیتے ہیں۔ اس میں کمپیوٹر کا کوئی دوش نہیں۔ دوش تو ان کو برتنے والوں کا ہے اور پھر وہ نعرے کمپیوٹر کا روپ دھارن کر کے بستیوں میں گھول دئے جائیں گے۔ اس طرح نفرت کے یہ کمپیوٹر ان کے چلانے والوں کے ہاتھوں جکڑ جائیں گے۔ اس کے بعد کیا ہوگا .... ؟ "گھور اندھکار" کیا پھر کوئی اوتار جنم لے گا ؟ ... جو پھر اس دھرتی کو پوتر کر دے گا۔"

اس معاملے میں لکشمن بڑا دھرم نرپیکش تھا۔ امن اور شانتی کا پجاری تھا۔ وہ دن رات امن و شانتی کا پیغام دینا چاہتا تھا۔ اسے شانتی پرستوں کی تلاش تھی۔ چلتے چلتے اب وہ ایسے مقام پر آ گیا تھا جہاں امن و شانتی کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اس نے اس طرف اپنے قدم اور تیز کر دئے۔ وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ کچھ نوجوان ہاتھوں میں امن کی تختیاں سے لئے یہ نعرے لگا رہے تھے۔ "قومی ایکتا زندہ باد" "ملک ہمارا زندہ باد" نعرو ںلے

کے دوران وہاں دو تین کاریں آکر رُکیں۔ ان میں سے سُرخ کار میں سے ایک پُرکشش عورت نکلی۔ مجمع کے لوگ اس کے اِرد گِرد بڑھنے لگے۔ لکشمن بھی اُن میں شامل ہو گیا۔ وہ عورت کو بڑی گہری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں بجلی کی سی چمک تھی۔ اس کا جسم رنگین ساڑی سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ دھرتی ماتا کی موہنی صورت کی طرح لگ رہی تھی۔ لکشمن کو دیکھ کر وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم کون ہو ؟"

لکشمن نے کہا۔ "مقتول" ۔ عورت نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "مگر تم تو زندہ ہو۔"

لکشمن ہاتھ اونچے کر کے بولا۔ "میرا قتل ہو چکا ہے۔ انسانیت کا قتل ہو چکا ہے۔"

عورت نے کہا۔ "مگر قاتل کون ہے ؟"

لکشمن نے کہا۔ "وقت میرا قاتل ہے اور دھرتی میرے خون سے لال ہو رہی ہے۔ دھرتی ماتا کا آنچل انسانیت کے خون سے رنگ گیا ہے۔ اور میں اس میں سماتا جا رہا ہوں ..." مقتول کی آواز سُن کر عورت پر سراسیمگی طاری ہو گئی۔ اس نے اپنی لمبی باہیں پھیلا دیں اور اسے اپنے آنچل میں ڈھانک لیا۔

یروشلم

عقیل شاداب
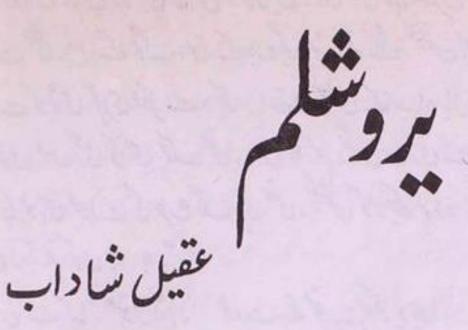
سارہ خاموش تھی، اپنی ہتھیلیوں کے کٹورے میں اپنا خوبصورت چہرہ لئے یوں بیٹھی تھی جیسے رحل میں قرآن۔ اس کے ماں باپ آج پھر بہت فکرمند نظر آرہے تھے آج پھر اجڑے ہوئے معصوم بے گناہ فلسطینیوں پر اسرائیل نے حملہ کیا تھا۔ تمام خیمے جلا ڈالے تھے۔ خال خال ہی کوئی زندہ بچا تھا۔ عرب مسلمانوں میں آج بڑا جوش تھا۔ یہودیوں کے خلاف نعرے لگائے جارہے تھے۔ نفرت کا اظہار کیا جارہا تھا۔ انتقام کی قسمیں کھائی جارہی تھیں اور شاید اسی لئے اس کے والدین پریشان تھے۔ کیوں کہ نسلاً عرب ہوتے ہوئے بھی مذہباً وہ یہودی تھے۔

سارہ کا کنبہ صدیوں سے اس سرزمین پر آباد تھا۔ اس کے بچپن کی بات ہے جب اس نے پہلی بار سنا تھا کہ اسرائیل وجود میں آچکا ہے اور دنیا بھر سے یہودی نقلِ مکانی کر کے اسرائیل جارہے ہیں۔ ان کے شہر سے بھی قریب قریب تمام یہودی گھرانے جا چکے تھے اور لٹے پٹے بے سہارا فلسطینیوں کے قافلے آرہے تھے۔ اسے بھی یہ سب دیکھ کر بڑا عجیب لگا تھا کہ جہاں صدیوں سے ایک قوم آباد تھی اسے آنِ واحد میں وہاں سے اجاڑ کر بے دخل کر دیا اور ایک ایسا ملک مذہب کی بنیاد پر بسا دیا گیا جس کا وہاں کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اس کا ننھا سا ذہن یہ سب کچھ سوچ کر الجھتا رہتا تھا اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو وہ جھنجھلا جاتی اور اپنا دماغ کسی دوسری طرف لگا دیتی۔

اس کے ماں، باپ نے بھی کئی مرتبہ یہاں سے جانا چاہا لیکن بستی کی مسلم عرب آبادی نے انھیں نہیں جانے دیا۔ اور ہر طرح ان کی دل جوئی اور حفاظت کی۔ کبھی انھیں دشمنی اور نفرت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ساری بستی انھیں پیار کرتی تھی اور سارہ ساری بستی کی چہیتی بیٹی تھی۔ ساری بستی والے اسے پیار سے یروشلم کہتے تھے اور وہ بھی اپنے اس نام سے بہت خوش تھی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ متناسب جسم، بیضوی چہرہ، گہری نیلی آنکھیں۔ ترشے ہوئے ہونٹ دراز زلفیں اور نکلتا ہوا قد۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہ ایک ننھی سی مقدس حور لگتی تھی۔ فلسطینیوں کے اجڑے ہوئے گھرانوں میں ایک حسن کا گھرانہ بھی تھا جو برباد ہو کر آیا تھا۔ حسن کیوپڈ کی طرح خوبصورت اور طرح دار تھا۔ وہ سارہ کے گھر کے قریب رہتا تھا اور اسی کے اسکول میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ہم جماعت تھے اور ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ وقت گذرتا گیا اور قربتیں بڑھتی گئیں۔ ان کی محبت شبنم کی طرح پاک تھی۔ شاید سرزمینِ عرب پر ایک بار پھر قیس و لیلیٰ نے جنم لیا تھا۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور ان کی چاہت پروان چڑھتی رہی۔ سارہ کے ماں باپ اسرائیل کے لئے پر تولتے رہے۔ مگر کچھ پرکھوں کی زمین کی کشش، کچھ عربوں کی روایتی مساوات اور رواداری اور کچھ سارہ کا شغف یہاں سے جانے میں آڑے آتا رہا۔

اچانک ایک دن ایسا طوفان آیا کہ سب کچھ درہم برہم اور برباد ہو گیا۔ نماز پڑھتے ہوئے سجدہ ریز فلسطینیوں کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا گویا قیامت آگئی۔ ہر طرف انتقام کے شعلے بھڑکنے لگے۔ ان کی بستی بھی محفوظ نہیں رہی اور لوگ مشتعل ہو کر ان کے گھر پر چڑھ دوڑے۔ حسن اور اس کے والدین سینہ سپر ہو گئے۔ بستی کے اور بھی بہت سے لوگ آگئے اور ان پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ اس کے ماں باپ دہل کر رہ گئے۔ وہ بھی گھبرا گئی تھی۔ مگر پھر اسے سب لوگوں کی محبت پر اعتبار آگیا اور وہ معمول پر آگئی۔ اس کے والدین سہم کر رہ گئے تھے۔ آخر اندیشہ ہائے دور دراز کے پیشِ نظر انھوں نے اسرائیل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتی رہی۔ اور سوچتی رہی کہ آخر وہ ایک اجنبی دیار میں کیسے آباد ہو سکے گی۔ اس کی جڑیں تو یہاں ہیں۔ کیا وہ اپنی مٹی سے رشتہ توڑ

پائے گی۔ کیا حسن کے بغیر وہ "پوری" رہ سکے گی۔ یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے "ادھوری" رہ جائے گی۔ وہ سوچتی رہی اور کڑھتی رہی۔ بالآخر وہ منحوس گھڑی آہی گئی۔

سارہ خاموشی سے اپنے والدین کے ساتھ مادرِ وطن کو چھوڑ کر جانے کو تیار ہو گئی۔ بس کھڑی ہوئی تھی۔ سامان لادا جا رہا تھا۔ ساری بستی انھیں غمناک نگاہوں سے تک رہی تھی۔ ان کا اپنا ایک عزیز ایک بھائی انھیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ یہ کیسا کمزور رشتہ تھا جو آج مذہب کے نام پر توڑا جا رہا تھا۔ سارہ جو سب کی بیٹی اور متاعِ بے بہا تھی وہ بھی جا رہی تھی۔ مٹی کی مقدس پکڑ اس کے قدم روکنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ حسن کا پیار بھی کارگر نہ رہا تھا اور سارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جا رہی تھی۔ بھاری قدموں سے سارہ بس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بستی والوں نے ان سے کوئی چیز نہیں چھینی تھی۔ وہ اپنا سارا اثاثہ لے کر جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ شہر والوں نے انھیں قیمتی تحفوں سے لاد دیا تھا۔ سارے مسافر بہ شمول اس کے والدین بس میں چڑھ چکے تھے۔ صرف سارہ رہ گئی۔ آخر اس نے بھی بس کے ہتھے پکڑ لئے اور ایک پاؤں پائیدان پر رکھ لیا۔ اس نے ایک نظر بس میں بیٹھے ہوئے اپنے ماں باپ کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں مجبوری تھی' لاچاری تھی اور التجا تھی۔ پھر اس نے مڑ کر حسن کی طرف دیکھا۔ جہاں پیار تھا ایثار تھا اور شکایت تھی بستی والوں کی آنکھوں میں اپنا پن تھا۔ اخلاص تھا اور مجبوری تھی۔ پھر اس نے اپنی مٹی کو دیکھا جہاں مامتا تھی اور ایک مقدس گرفت تھی۔ سارہ یہ سب کچھ دیکھ کر لرز گئی۔ اس کے ہاتھ سے بس کا ہتھا چھوٹ گیا اور اس نے پائیدان سے اپنا پاؤں کھینچ لیا۔ بس چل دی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ گرد و غبار رہ گیا۔ جب غبار بیٹھا تو سب نے دیکھا کہ سارہ حسن کے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی۔ ساری بستی مسحور و مسرور تھی۔ آسمان سے فرشتے پھول برسا رہے تھے اور مٹی اپنی بیٹی پر فخر کر رہی تھی۔ آج نفرت ہار گئی تھی اور محبت جیت گئی تھی۔ عربوں کو ان کا "یروشلم" مل گیا تھا۔ ہر شخص خوش تھا اور اپنی اس فتح پر نازاں۔ سب کے لبوں پر ایک ہی لفظ کی گردان تھی "یروشلم" "یروشلم" "یروشلم" !!

———•———

بے آواز فریاد

عمر جہاں

آج برتن صاف کرتے ہوئے موسی چپ چپ تھی۔ نل کی ٹونٹی کھولتے ہوئے یا برتن پر پاؤڈر لگاتے ہوئے کچھ بڑبڑانے لگی۔ اس کے بڑبڑانے سے خاموشی ایک لمحے کے لئے ٹوٹ جاتی لیکن دوسرے لمحے موسی پھر خیالوں میں کھو جاتی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو اپنے آس پاس کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے لیکن اپنے بس میں نہیں ہونے کی وجہ سے برتن یا تو بہت صاف ہو کر چمکنے لگتے یا کچھ برتن صاف نہیں دھلتے

موسی پر اس قسم کا دورہ ہر مہینے کے آخر میں پڑتا تھا اور کئی دن موسی اسی طرح اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی اور کبھی بڑبڑاتے ہوئے گذارتی۔ میں اس کی اس کیفیت سے اچھی طرح آگاہ تھی۔ شروع شروع بہت احساس ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ خود اس کو اپنی انگلیاں چلانے یا سبزی کی چھری سے چیرا لگنے تک کا احساس باقی نہیں رہا تھا۔

موسی میرے گھر بہت سالوں سے کام کر رہی تھی اور مجھے اس کے گھریلو حالات کا علم بخوبی تھا۔ پہلے تو اس کا شوہر زندہ تھا اور جب اس سے موسا کی کھٹ پٹ ہو جاتی تھی تو موسی مجھ سے اس کی ڈھیروں برائیاں کرتی لیکن جب دونوں میں صلح ہو جاتی تو موسی اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیتی۔

اور چھیڑنے کے لئے میں پھر اس کے گنائے ہوئے عیب دہراتی موسی اپنی لوگڑی میں منہ چھپا کر کہتی کہ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ دھنو موسی کو بہت پیار کرتا تھا۔ موسے کا

رنگ بہت گورا ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں، کالی کالی پلکوں سے سجی سنوری سب کو اچھی لگتی۔
موسا کے ناطے کی بات موسی سے صرف اس کی خوبصورتی کی وجہ سے ٹھہری تھی کیوں کہ موسی نے اپنی ماں سے کہا تھا۔
" ماں مجھے گھر کا دیا نہیں محفل کا اجیارہ چاہیئے کہ جب اس کو کوئی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔"
اور سچ بھی یہی تھا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی موسی کی خوبصورتی پوری شادی میں موضوع گفتگو ہی رہی۔ آنے والے پھلنے پھولنے کی دعائیں دیتے رہے۔
موسا کی محبت پاکر موسی اور نکھر گئی اور پھر بہت سالوں تک موسی پھلتی پھولتی رہی۔ نو بیٹے اور دسویں بیٹی موسا موسی کو بہت پیارے تھے۔ موسا کی آمدنی اچھی خاصی تھی لیکن بچوں کی زیادتی اور سخت محنت کے باوجود ان کی صحیح پرورش نہیں ہو پارہی تھی۔ بچے تو کھل کر اپنی اپنی راہ لگ گئے۔ بیٹی کی شادی موسی نے دھنّو موسا کی زندگی میں ہی کردی تھی۔ ایک بھی بیٹا موسا موسی کا خیال نہیں رکھتا تھا۔ بڑے بیٹے تو پھر بھی کام دھندے سے لگے ہوئے تھے لیکن چھوٹے بیٹے اندھی گلیوں کے راہی بن گئے تھے۔ ساری بری لتیں انھوں نے پال رکھی تھیں۔ ایک لڑکی لے کو بھاگ گیا۔ دوسرے کو لڑکی بھگالے گئی۔ ایک چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔
اس رات کو جب موسا کام سے واپس آیا تو موسی نے کہا۔
" رمیش کو پولیس لے گئی ہے اس کو چھڑا لاؤ۔"
موسا نے کہا۔ " میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کنواں کھودنا ہے۔ پھر بھی پیٹ کا پورا نہیں ہے۔"
" لے جانے دو پولیس کو! پولیس کی مار کھائے گا۔ چوری کی عادت چھوٹ جائے گی حرام خور کی۔"
موسی رونے لگی۔

روتی ہوئی موسی کو دیکھ کر دھنو موسا کو جو غصہ آیا تو اس نے سب برتن توڑ دیے۔ لکڑی لے کر ایک ساتھ سب کی پٹائی کر دی۔ " سالے حرام خور۔"

" چوریاں کریں گے۔ کل کا نام ڈبوئیں گے۔"

چلاتے ہوئے موسا گھر سے نکل گئے۔

واپس آئے تو رمیش ساتھ تھا۔

گھر لاکر موسا نے رمیش کی بہت پٹائی کی۔ اور سب کو کہہ دیا کہ رمیش سے کوئی بات نہیں کرے گا۔

ایک دو دن تو رمیش گھر میں ہی رہا۔ اس کے بعد جو گیا تو واپس نہیں آیا۔

موسا اسی غم میں دنیا سے کوچ کر گیا۔

اور موسی تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔

لیکن اس کی بے آواز فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔

دل میں کہتی۔

" جانے کہاں ہوگا؟ میرا لال!"

" کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں؟ بھوکا ہوگا؟"

میں خود بھوکی سو گئی لیکن اپنے بچوں کو ہمیشہ کھلایا پلایا ہے اور کیسی کیسی پریشانیوں سے پالا ہے۔

وہ سب سے چھوٹا تھا نا۔ سب سے لاڈلا بچہ تھا میرا......

دل میں ہوک اٹھتی اور وہ تڑپ تڑپ کر روتی۔

رمیش کی تلاش میں موسی نے بہت پیسہ خرچ کیا۔

سارے برتن بھانڈے بیچ دیے۔

جب بھی کوئی کہتا ہم نے رمیش کو فلاں جگہ دیکھا ہے۔

موسی فوراً کہیں نہ کہیں سے پیسہ لاتی اور بڑے بیٹے کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔

جا بیٹا! لے آ' اس کو جا کر۔

لیکن رمیش نہیں ملتا۔

آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہو گیا تو موسی نے میرے یہاں آکر نوکری کر لی۔

ایک ایک پیسہ جوڑتی اور جب کہیں کچھ سراغ پاتی تو پھر آس باندھ لیتی۔

اور رمیش نہیں ملتا تو موسی ٹوٹ سی جاتی۔

سب بیٹوں سے لڑتی۔

" ارے کوئی تو جاؤ۔ میرے لال کو لاکر ملا دو۔"

ایک بیٹا جواب دیتا۔

" ماں! تیرے اتنے لال ہیں ایک نہیں ہے تو کیا ہوا؟"

موسی کے کلیجے پر یہ بات کٹار کی طرح لگتی۔

دوسرا اپنے بچے کو پیار کرتے ہوئے کہتا۔

" ماں! ہمارا اپنا ہی پورا نہیں پڑتا۔ اس کی تلاش میں وقت اور پیسہ کہاں سے لائیں۔"

بک جھک کر موسی ہمت باندھتی اور پھر پیسہ جوڑنے میں لگ جاتی۔ دو تین سالوں سے یہ کھیل جاری تھا۔

اب پھر موسی نے اپنے بڑے بیٹے راجو کو کچھ پیسے دئے۔

" بیٹا! رمیش کا دوست ملا تھا۔

اس نے رمیش کو جے پور میں رکشا کھینچتے ہوئے دیکھا ہے۔ جا ڈھونڈ کر لے آ اسے تیرا بھائی ہے۔"

موسی نے بہت آس لگا کر راجو کو بھیجا تھا اور خود کئی دن سے آشا نراشا کے جھولے میں جھول رہی تھی۔

میں نے سوچا آج راجو واپس آگیا ہوگا اور رمیش اس کو نہیں ملا ہوگا اس لئے موسی کی یہ حالت ہوئی ہے۔

میں نے پوچھا۔ " موسی! چپ چپ کیوں ہو؟"

موسی چونک گئی۔

بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

جب موسی رو چکی تو بولی۔

"کیا بتاؤں۔ رمیش تو چوری کے جرم میں رتلام جیل میں بند ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتہ؟"

"میرے بڑے بیٹے راجو کو یہ بات پہلے سے ہی پتہ تھی۔ کل شام کو میں جیسے ہی گھر پہنچی تو مجھے راجو کے آنے کا پتہ چلا۔ میں رمیش کا حال معلوم کرنے اس کے کمرے کی طرف گئی تو دروازے پر میں نے سنا۔

راجو کی پتنی کہہ رہی تھی۔

"جے پور سے بچوں کے کپڑے ہی لائے۔ میرے جھمکے نہیں لائے؟"

راجو نے کہا۔ "تمہارے لئے کچھ نہ لا سکا۔ گھومنے پھرنے میں سب کچھ ختم ہو گیا۔"

تو اس نے راجو سے کہا۔

"نہیں لائے تو میں بھی ماں کو بتا دوں گی کہ رمیش تو پہلے ہی سے رتلام جیل میں بند ہے اور یہ تمہیں ٹھگتے رہے ہیں۔"

راجو نے کہا۔

"ارے پگلی! اطمینان رکھ۔ اب کی بار ماں سے کہوں گا کہ رمیش دہلی میں دیکھا گیا ہے اور پھر تجھے جھمکے لا دوں گا، فکر کاہے کی۔"

——— ٭ ———

اغوا

فرزانہ خان

رحیم کی ماں بیٹھے بڑبڑا رہی تھی۔ "میری بات کان کھول کر سن لے رضیہ کل سے اسکول نہیں جائے گی۔ اللہ بچائے زمانہ بڑا خراب ہے' بہو بتا رہی تھی کہ فوج کے بڑے افسر کی لڑکی کو غنڈے اٹھا کر لے گئے پھر ہماری بساط ہی کیا ہے۔ کل کو خدانہ کرے کچھ ہو جائے تو ہم برادری میں منھ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔"

رحیم نے ماں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ رضیہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "پورے تیرہ برس کی ہو گئی ہے ڈھینگری کے اب تک تو بچے ہو جانا چاہیئے تھے۔"

رحیم کی ماں کی بے چینی کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک کے آرمی چیف کی لڑکی "وبھوتی" کو اغوا ہوئے تین دن گذر گئے تھے' سرکاری مشینری کی پوری کوشش کے باوجود بھی ابھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اغوا کنندگان اور سرکاری نمائندوں میں بات چیت ابھی جاری جاری تھی۔

تپن چوپڑا کے ماں باپ جنرل شیو ناتھ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ تپن اور وبھوتی ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے اور بہت جلد شادی کے بندھن میں بندھنے والے تھے۔ جنرل شیو ناتھ کی پریشانی کسی سے چھپی نہیں تھی۔ پچھلے تین دنوں نے انھیں تیس سال بوڑھا کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ سُن ہو گئے ہیں اور ان پر کسی بات کا اثر نہیں

ہوگا۔ مگر اندرونی کیفیت اضطراب کی تھی۔ اپنی بیٹی کا معصوم چہرہ ان کی آنکھوں میں برابر گھوم رہا تھا۔ تپن کی ماں شیونا تھ کے چہرے کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی.
" میرے تپّی کی بُری حالت ہے' مسٹر چوپڑا بہت سمجھاتے ہیں مگر اسے تو کچھ ہوش ہی نہیں ہے۔ کھانا پینا' بات کرنا سب چھوڑ رکھا ہے۔ بھگوان کرے وبھوتی جلد آ جائے"۔
جرنیل شیونا تھ کو صرف یہ خیال رو کے ہوئے تھا کہ وہ اتنے بڑے ملک کے آرمی چیف ہیں۔ نہیں تو ان کا دل یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔
مسز چوپڑا بولے ہی جا رہی تھیں۔ " آپ سرکار پر دباؤ کیوں نہیں ڈالتے۔ مجھے تو لگتا ہے سرکار وبھوتی کی رہائی کے بدلے میں ان ملک کے باغیوں اور غداروں کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوگی۔"
مسٹر چوپڑا نے شیونا تھ جی کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بھانپتے ہوئے بات کا رُخ بدلا " کیا آپ کی ملک کی خدمت کا یہی نتیجہ ہے؟ ملک کے آرمی چیف کی لڑکی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ سرکار کو بغیر کسی تاخیر کے ان تینوں باغیوں کو چھوڑ دینا چاہئے۔ ویسے تو شیونا تھ جی پچھلے تین دنوں میں اس طرح کی کافی ہمدردی حاصل کر چکے تھے۔ ان کو کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ چوپڑا دمپتی (زوجین) وہاں سے کب اٹھ کر چلے گئے شیونا تھ کو یہ بھی دھیان نہیں رہا۔ ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ حالانکہ انھیں یہ فکر نہیں تھی کہ واپس آنے کے بعد بیٹی کی شادی بیاہ کا اب کیا ہوگا وہ سماج میں اپنے پیسے اور عہدے کی طاقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان کی پریشانی یہ تھی کہ نہ جانے بدمعاشوں نے ان کی بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟
شیونا تھ جی اس فکر میں گم تھے۔ رات کافی ڈھل چکی تھی۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ شیونا تھ جی کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ رسیور اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا۔ کچھ رکے' پھر اٹھا ہی لیا۔ شیونا تھ کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ خبر سن کر رسیور ہاتھ سے چھوٹ گیا' وہ بڑبڑائے۔ " اب کچھ نہیں رہا' کچھ نہیں رہا۔" ممتا اور دوسرے نوکر کمرے کے باہر ٹیلیفون کی گھنٹی سے وبھوتی کی رہائی کی آس لگائے کھڑے تھے۔ شیونا تھ انھیں دیکھ زور سے چلائے۔ " جاؤ مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں' اب یہاں کیوں کھڑے ہو' اپنے

لوگوں نے وبھوتی کو مار دیا، میں انھیں چھوڑوں گا نہیں۔" شیو ناتھ کی اُونگھ ٹوٹی، آرمی کیمپس کے مندر کی گھنٹی بج رہی تھی۔ جنرل شیو ناتھ پسینے پسینے ہو رہے تھے مگر ان کو یہ جان کر تسلی ہوئی کہ وہ ایک برا خواب تھا۔ گھڑی پر نظر پڑی تو ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ صبح کے چھ بج رہے تھے۔ دہشت پسندوں کی مانگیں پوری ہونے کی میعاد ختم ہونے جارہی تھی اور وہ پہلے ہی اعلان کر چکے تھے کہ میعاد ختم ہونے پر وبھوتی کو کبھی بھی ہلاک کر دیں گے۔

دفتروں، ہوٹلوں، کلبوں اور پارٹیوں میں ہر طرف یہی چرچا تھی کہ ایک بڑے آدمی کی لڑکی کا اغوا ہوا، اس لئے یہ خبر ریڈیو، ٹی وی اور اخبار کی سرخیوں میں ہے، جب کہ آئے دن غریبوں کی بیٹیوں کا اغوا ہوتا ہے اور کوئی یہ جاننے کے لئے بے چین نہیں رہتا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔

وبھوتی کے ساتھ دو اور لڑکیاں پرشنسا اور رادھا کا بھی اغوا ہوا تھا۔ وبھوتی اپنی سہیلی پرشنسا کے ساتھ دور دراز کی ایک کچی بستی میں غیر قانونی شراب بنائے جانے کی رپورٹ تیار کرنے جایا کرتی تھی۔ اس دن جب وبھوتی وہاں سے لوٹ رہی تھی تب کچی بستی کی ایک لڑکی رادھا جو غریبی کی وجہ سے پڑھ نہیں سکی تھی، اور وبھوتی کی شخصیت سے متاثر تھی، اپنے باپ کے لئے شراب لینے وبھوتی کے ساتھ شراب کی بھٹی کی طرف جارہی تھی۔ اچانک کچھ غنڈوں نے پیچھے سے آکر ان کا راستہ روک لیا۔ رادھا نے بہادری دکھانے کی کوشش کی لیکن وبھوتی کی سمجھداری نے اسے روک دیا۔ وہ ہتھیاروں سے لیس تھے۔ بدمعاشوں میں سے ایک نے وبھوتی کو اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ دوسرا بولا۔" اگر ان دونوں کو چھوڑ دیا تو یہ رپورٹ کر دیں گی اور ہم زیادہ دور نہیں جا سکیں گے۔ ان کو بھی ساتھ لے چلو۔" ہنس کر بولا " کچھ کام ہی آئیں گی۔"

پرشنسا کے گھر میں اس طرح کا ماتم پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ گھر میں موت ہونے پر رشتہ دار اور پڑوسی ہمدردی دکھاتے ہیں۔ اس لئے اس کا غم اتنا محسوس نہیں ہوتا۔ مگر آج رشتہ دار اور ملنے والے سبھی ماسٹر جی کو ہمدردی میں بھی طعنہ دے رہے تھے۔ ایک تو بیٹی کا

غم' نہ جانے کس حالت میں ہوگی' دوسرا مڈل کلاس سوسائٹی — اپنے خاندان کی عزت کا خیال .... ماسٹر کی حالت جرنیل شیو ناتھ سے کہیں زیادہ بدتر تھی۔ اور پرشنسا کی ماں کبھی اس کی منت ملامت کرنے والی عورتوں سے لڑ پڑتی تھی۔

اغوا کے چوتھے دن سرکار اور اغوا کرنے والوں میں سمجھوتا ہو گیا۔ وبھوتی کو چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ پرشنسا اور رادھا بھی رہا ہو گئیں۔ جرنیل شیو ناتھ بہت خوش تھے۔ ان کی بیٹی گھر واپس آ گئی تھی۔ وبھوتی کے دوست اور چاہنے والے کافی تعداد میں گھر پر جمع تھے وہ ان سے گھر میں بیٹھی اغوا ہونے کا اپنا تجزیہ ہنس ہنس کر سنا رہی تھی۔ اس کی سہیلی انجلی بولی۔ "مارولس! یہ بھی خوب رہا...... لائف میں اگر ایڈوینچر نہ ہو تو جینے کا مزا ہی کیا ہے۔ آگے جب بھی تجھے اغوا ہونا ہو تو مجھے بھی ساتھ لے چلنا۔" اس کی بات سن کر تپن زور سے ہنسا۔ دوسرے ساتھی بھی ہنسنے لگے۔ تپن کے لئے یہ بے معنی تھا کہ اغوا کرنے والوں نے وبھوتی کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ تو اپنی وبھوتی کو پا کر بہت خوش تھا۔ دونوں دیر تک باہوں میں باہیں ڈالے ڈانس کرتے رہے۔ اور لوگ بھی ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ پارٹی ساری رات چلتی رہی۔

وبھوتی کی ایک ساتھی رادھا رہا ہونے پر کچی بستی کی اپنی جھونپڑی میں پہنچی۔ اس کا بوڑھا باپ ایک کونے میں پڑا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں تھا کہ اس کی لڑکی تین دن سے غائب ہو اور گھر میں چولہا نہ جلا ہو۔ اس کے باپ کو اصل غصہ یہ تھا کہ اس بار رادھا باپ کے شراب کا انتظام کئے بغیر ہی غائب ہو گئی تھی۔ رادھا کا باپ بیٹی کو دیکھ کر اس پر لپکا۔ "تیری تین رات کی کمائی کہاں ہے؟ ادھر لا۔ تیرے یاروں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ حرامی ایک بھی کام کا نہیں ہے۔ ایک شراب کی بوتل لا کو نہیں دے سکتے۔ جنم جلی' اب بھی بوتل لائی یا خالی ہاتھ ہی مرنا ہے۔"

رادھا کی آنکھوں میں غصہ اتر آیا۔ وہ بوڑھے باپ کو دور ہٹاتے ہوئے چلائی۔ "بڈھے تجھے کیا معلوم' چار دن سے وبھوتی دیدی اور میں ایک اندھیری کوٹھری میں بند تھے۔ ایک دھیلا بھی نہیں ملا' اور کھوسٹ تجھے اپنی شراب کی پڑی ہے۔"

جہاں چھوٹنے کے بعد رادھا کو اغوا ہونے کا کوئی احساس بھی نہیں ہوا اور وبھوتی کے لئے اغوا کے بعد لوٹ کر گھر آنا ایک خوشی کا دن بن کر آیا' وہیں بیچاری پوشنما کے لئے اغوا ہونے سے بھی زیادہ لوٹ کر واپس آنا برا ثابت ہوا۔ حالانکہ اس کے اغوا ہونے سے ماں باپ کا دل اپنی بیٹی کے لئے پریشان تھا' لیکن اپنی غریبی اور مڈل کلاس سوسائٹی کی سوچ کی وجہ سے زیادہ پریشان تھے کہ جب بیٹی لوٹ کر آئے گی تب کیا ہوگا۔

پوشنما کے آزاد ہونے کی خبر ملنے کے بعد تو گویا' اس کے صحیح سلامت گھر آنے کی خوشی بھی ختم ہو گئی تھی' صبح سے ہی گھر میں آس پڑوس اور رشتہ دار جمع ہونے لگے تھے۔ طرح طرح کی کانا پھوسی ہو رہی تھی۔ ایک دو منھ پھٹ عورتوں نے تو ڈری سہمی پوشنما سے یہاں تک پوچھ لیا کہ کتنے آدمیوں کے ساتھ رات بتا کر آئی ہے؟

کوئی کہہ رہا تھا۔ "چار دن تک گھر سے باہر رہی۔ ماسٹر جی نے پھر بھی رکھ لیا۔"

"کالک پوت دی اپنے ماں باپ کے منھ پر۔"

"بھگوان نہ کرے ایسا کسی کے ساتھ ہو۔"

کچھ رشتہ داروں نے تو یہ بھی کہا۔ "تو واپس کیوں آگئی۔ کچھ تو اپنے بوڑھے ماں باپ کا خیال کیا ہوتا۔ ہمارے بھی لڑکیاں ہیں' تیری وجہ سے ان کا اٹھنا مشکل ہو جائے گا۔"

اب تو بھگوان کے بعد پوشنما کو اس کے منگیتر "اتل" کا ہی سہارا تھا۔ کہ وہ اسے سمجھے گا اور تسلی دے گا۔ مگر جب وہ آیا تو پوشنما کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ پوشنما بے حد مایوس ہوئی۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ڈھلتی دھوپ کے ساتھ جھوٹی ہمدردی دکھانے والے رشتہ دار اور پڑوسی اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ مگر ان کی طعن و تشنیع سے پوشنما پوری طرح زخمی ہو چکی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دھرتی پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ اپنے پاک صاف ہونے کا کیسے یقین دلائے۔ سب لوگ' یہاں تک کہ ماں باپ بھی اسے اجنبی نظر آرہے تھے۔

سورج غروب ہو چکا تھا مگر چاند ابھی نہیں نکلا تھا۔ خوشی سے کھلکھلاتے

وبھوتی اور تپن نے پرشنسا کا حال معلوم کرنے کے لئے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر آنے پر پرشنسا کی ماں نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں پرشنسا تھی ۔ جیسے ہی وبھوتی نے پرشنسا کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ پرشنسا کی گردن ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی۔ وہ اس دنیا سے دور کسی دوسری دنیا میں چلی گئی تھی۔ اسے دیکھ وبھوتی کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کا بھی اغوا ہوا تھا۔

———— ❋ ————

قدرت کا کرشمہ

قیصر رشید بھارتی

ڈاکٹر پرویز خاور اپنی تجربہ گاہ پر، جو کہ شہر سے دور کسی پہاڑی جنگل کے ایک خفیہ غار میں واقع تھی، آرام کرسی پر سوتے سوتے اچانک جاگ اٹھے تھے۔ پہلے تو ایک اُباسی لی پھر سستی دور کرنے کی غرض سے انگڑائی لی اور پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تمام تجربہ گاہ درہم برہم سی تھی۔ سب سامان گرا ہوا تھا۔ بوتلیں، جار اور دیگر کانچ کا سامان چکنا چور ہو کر ریزہ ریزہ زمین پر بکھرا ہوا تھا۔ ان سب میں بیش قیمت وہ بوتل تھی جس میں پرویز کی زندگی کی کل محنت اور کامیابی بھری ہوئی تھی۔ مگر افسوس صد افسوس وہ بوتل بھی فرش پر ٹوٹی پڑی تھی اور وہ رقیق مادہ فرش پر اب بھی پھیلا ہوا تھا۔ گویا کہ اس کا سب کچھ تباہ ہو گیا تھا... مگر قدرت کا کمال دیکھئے کہ خوفناک زلزلہ سے جہاں سب کچھ فنا فی اللہ ہو گیا وہیں پرویز کی چائے کا پیالہ جوں کا توں بچ گیا بلکہ اس میں موجود چائے میں سے اب بھی بھاپ نکل رہی تھی۔ اس نے وہی چائے پی اور پھر کفِ افسوس ملتا ہوا اپنی تباہ شدہ تجربہ گاہ کو حسرت بھری نظر سے دیکھنے لگا اور خود کلامی کرنے لگا۔ "یا خدا یہ کیسا زلزلہ تھا جس نے میری تمام محنت کو رائیگاں کر دیا۔ میری کامیابی، میری زندگی کی کل کمائی اور کل مقصد کو ایک لمحہ میں نیست و نابود کر دیا۔ کل ہی تو میں تمام شہر میں دھوم مچا کر آیا تھا کہ میں ایک ایسی ایجاد میں کامیاب ہوا ہوں جو مجھے، اس شہر کو اور اس وطن کو حیاتِ جاوداں عطا کرے گی۔ آج میں اپنی کامیابی کا مظاہرہ سب کے سامنے کرتا تو میرے والدین کا سر

فخر سے اونچا اٹھ جاتا۔ میرے دوست، احباب مجھے لفاظ اور گپ باز نہیں سمجھتے۔
میرے ہونے والے سسُر سلطان صاحب اپنی دختر گلنار کے ہمراہ خوشی سے میری
شادی کر دیتے۔ اور میری گلِ گلنار، میری دلبر، میری محبوب تو میری کامیابی پر پھولی نہ سماتی۔
وہ تو آج چار بجے میرا انتظار پھول باغ میں کرے گی ہی مگر تمام لوگ میری کامیابی کی
سچائی دیکھنے کے لئے بے چین اور بے تاب ہوں گے۔ اب میں کیا مُنہ دکھاؤں گا لوگوں کو
کون مانے گا میری بات؟ میں تو کامیاب ہوکر بھی ناکام ہوگیا۔" پرویز یوں ہی بڑبڑاتا ہوا
غار کے دہانے کے پاس آگیا۔ وہاں اس کی نظر ایک طرف پڑے ایک تھیلے پر گئی۔ اس نے
اسے کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیوں کہ اس تھیلے میں ہیرے جواہرات
اور سونے کے زیورات بھرے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا شاید یہ پرانا خزانہ ہے اور خدا
نے میری مایوسی کو کم کرنے کی غرض سے یہ انعام مجھے عطا کیا ہے۔ پرویز نے وہ تھیلا اٹھا
لیا اور غار سے باہر نکل آیا۔ غار کے باہر چاروں طرف دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ اس
نے کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے پھر ایک انگڑائی لی اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ اس
نے دیکھا غار کے مُنہ کے پاس ایک گول پتھر پڑا ہوا ہے جو اس کے بے ہوش ہونے سے
قبل غار کے دہانے پر آکر فٹ ہوگیا تھا۔ پھر یہ ہٹایا کس نے اور اتنی جلدی کیسے؟ پھر
اس نے آدمی اور گھوڑوں کے پاؤں کے تازہ نشانات غار کے اندر اور باہر دیکھے۔ اس
کی سمجھ میں آگیا کہ یہ سب ڈاکوؤں کا کارنامہ ہوگا۔ اس نے سوچ لیا کہ اب اس دولت پر
اس کا کوئی حق نہیں۔ اسے سرکار میں جمع کرا کے اصل حقدار کو ہی دلوائے گا۔ پھر اس کی
نظر آس پاس کے ماحول پر گئی اسے لگا کہ جیسے بہت کچھ بدل گیا ہے۔ کل جب وہ یہاں سے
آیا تھا تو ان گنت درخت اس جنگل کو خوب گھنا کئے ہوئے تھے۔ مگر اب سب کچھ برائے
نام ہے۔ اس نے سوچا کہ یہ بھی زلزلہ کا ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ پھر وہ اپنے ہی خیالات
کے سلسلہ کی گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا شہر کی جانب روانہ ہوگیا۔ حالانکہ اس کے خیالات کی
اندرونی کشمکش اور الجھن اس کے دل و دماغ کو پوری طرح اپنی طرف مائل کئے ہوئے تھی
مگر راستہ کی تمام تر تبدیلیاں اور بکھراؤ لاشعوری طور سے اس کے ذہن کو متاثر کر رہا تھا۔

وہ ایک عجیب سی خلش سے دو چار ہو رہا تھا۔ پرویز یوں ہی بے چینی کے عالم میں چلتا ہوا شہر میں داخل ہوا۔ یہاں آکر اچانک اس کا شعور بیدار ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اس کی عقل حیران رہ گئی کہ شہر تین کلومیٹر پہلے ہی شروع ہوگیا۔ یہ مقام جہاں وہ آکر رکا ہے۔ کل جب وہ یہاں سے گذرا تھا تو ایک سنسان اور بنجر علاقہ تھا میلوں دور تک پیلے پتے والے کانٹے دار ببول کے پیڑ پھیلے ہوئے تھے۔ مگر آج یہ ایک ہی دن کے مختصر سے وقفہ میں آبادی کا زبردست سیلاب، یہ فلک بوس عمارات کا ہجوم، یہ سائنس کی ایک سے ایک نئی ایجاد، یہ ترقی یہ سب کیا ہے۔ لوگ جن سواریوں پر آجا رہے ہیں ان میں سے تو کئی کے وہ نام بھی نہیں جانتا لوگوں کا رہن سہن، طور طریقہ، اندازِ گفتگو اور معیارِ زندگی سب کچھ یکسر بدل سا گیا۔ کل جب وہ یہاں سے گیا تھا تو شہر میں فقط دو کاریں تھیں ایک نواب صاحب کے پاس اور دوسری انگریز ایجنٹ کے پاس جو کہ اس پہاڑی پر بنے ایجنٹی بنگلہ پر رہتا تھا اور نواب صاحب نذر باغ کے عالیشان محلات میں۔ کچھ صاحبزادگان کے پاس بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔ باقی سے زیادہ تر مکان کچے ہی تھے۔ کوئی آٹھ دس سائیکلیں بھی تھیں۔ کچھ لوگوں کے پاس اپنے ذاتی تانگے بھی ہوا کرتے تھے۔ دو چار گھروں میں ریڈیو بھی تھے۔ ایک دوائی کی دوکان اور وہی جنرل اسٹور بھی ہوا کرتا تھا۔ وہیں دس بیس اخبار بھی آتے تھے۔ مگر آج تو سب کچھ حیرت میں ڈال رہا ہے۔ اتنی جلدی اتنی ترقی ..... عقل اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ ایک سائنس داں ہونے کے ناطے وہ خود بھی اپنے شہر اپنے ملک و وطن کے مستقبل کو سجانا سنوارنا چاہتا تھا۔ اس کی بھی دلی خواہش تھی کہ اس کا وطن عزیز ترقی کی راہوں پر گامزن ہو اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں اس کا شمار صفِ اول میں ہو.....!
مگر ایک ہی دن میں یہ عظیم الشان تبدیلی، یہ زبردست کامیابی اور یہ بے پناہ ترقی۔ بلکہ چائے ٹھنڈی ہونے سے بھی پہلے ..... اتنا سب کچھ ہوگیا۔ اس کی بے پناہ توقعات سے ہزار گنا زیادہ .....! وہ سوچ رہا تھا انسانی عقل اور اس کی بے شمار کامیابیوں اور کارناموں سے کروڑوں گنا زیادہ یہ معجزہ خدا کی قدرت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ورنہ ایک ہی دن میں انسان کو ترقی کے چوتھے آسمان پر پہنچتے نہ دیکھا نہ سنا۔؟

پھر بھی اس نے یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ وہ واقعی اپنے ہی شہر میں ہے ایک راہ چلتے شخص سے دریافت کیا۔ "کیوں بھائی۔ یہ کونسا شہر ہے؟" پہلے تو اس شخص نے پرویز کو سر تا پا ایسے گھور کر دیکھا جیسے وہ کسی عجوبے سے روبرو ہوا ہو۔ پھر بڑی لاپرواہی سے بولا "امیر پور" "تو یہ ایک ہی دن میں اتنا بدل کیسے گیا؟" پرویز کے دوسرے سوال پر وہ شخص اسے پاگل تصور کرتے ہوئے بغیر کوئی جواب دئے آگے بڑھ گیا۔ پرویز نے محسوس کیا کہ اگر وہ لوگوں سے سوال کرے گا تو سب اسے پاگل سمجھیں گے۔ اس لئے اس راز کی گتھی کو خود ہی سلجھانا ہوگا۔ وہ پھر آگے بڑھ گیا اور گھنٹہ گھر کو دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کیوں کہ اسے لگا کہ اس نے اپنی پرانی پہچان ایک حد تک برقرار رکھی ہے۔ وہیں اسے ایک گھوڑا تانگہ بھی نظر آیا جہاں تانگہ ہی تانگہ کھڑے ہوئے تھے وہاں رکشائیں اور آٹو رکشا کھڑے تھے۔ اس نے سائیکل رکشا دیکھی تھی مگر کل تک اس شہر میں ان کا چلن نہیں تھا۔ فقط تانگے ہی ہوا کرتے تھے جو ایک دو کو چھوڑ کر تمام ندارد ہیں۔ اس نے بوڑھے تانگے والے سے کہا "پھول باغ چلوگے"؟ "چلو صاحب" تانگے والے نے جواب دیا اور پرویز خاموشی کے ساتھ تانگہ میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد پرویز نے تانگے والے سے سوال کیا "کیوں بھائی میں پاگل تو نہیں لگتا؟" "نہیں تو کون کہتا ہے؟" "نہیں ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔" تانگہ شہر کے بڑے بازار سے ہوتا ہوا پھول باغ کی طرف بڑھتا رہا۔ پرویز حیرت زدہ آنکھوں سے تمام تر تبدیلیاں دیکھتا رہا مگر خاموشی کے ساتھ۔ "لو جی آپ کا پھول باغ آگیا۔" تانگے والے نے تانگہ روکتے ہوئے کہا۔ پرویز تانگے سے نیچے اترا اور کرایہ دریافت کیا۔ "کیا دینا ہوگا؟" "پانچ روپیہ صاحب" تانگے والے کا جواب سن کر پرویز کو حیرت ہوئی۔ کل تو بڑے کنویں سے گھنٹہ گھر کا کرایہ صرف ایک آنے تھا اور آج .... اس نے بغیر کچھ کہے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر تانگے والے کو دیا۔ تانگے والے نے نوٹ کو لیتے ہوئے بڑے تعجب کے ساتھ پرویز کو دیکھا اور بولا "صاحب یہ نوٹ تو انگریزوں کے زمانے کا ہے۔ اور آج تو ہندوستان آزاد ہے۔" پرویز کو ایک عجیب سی الجھن کا احساس ہوا مگر وہ جھنجھلایا نہیں۔ بلکہ خاموشی کے ساتھ جیب سے ایک کلدار روپیہ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "اس

وقت بھی میرے پاس ہے۔" تانگے والے نے خوشی خوشی وہ روپیہ لے لیا کیوں کہ وہ چاندی کا تھا۔ اور آج کے بازار میں کوئی بھی اس کے ساٹھ روپیہ دے دیگا۔ وہ پرویز کو سلام کر کے تانگہ موڑتے ہوئے واپس چلا گیا۔ اور پرویز پھول باغ میں داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا باغ تو وہی ہے مگر نہ وہ بہار ہے نہ وہ فضا۔ باغ کے احاطے میں لوگوں کے مکان تھے۔ جانور بندھے ہوئے تھے۔ اپلے تھپے ہوئے سوکھ رہے تھے۔ ہاں وہ بڑ کا درخت وہی تھا جس کے نیچے ہری گھاس پر بیٹھ کر وہ اپنی گلِ گلنار کے ساتھ پہروں پیار بھری پُرمسرت زندگی گذارتا تھا۔ عہدوپیماں کیا کرتا تھا۔ آنے والی زندگی اور مستقبل کے لئے سنہری خواب دیکھتا اور دکھایا کرتا تھا۔ مگر یہ کیا؟ آج اس درخت کے نیچے اس کی حسین، جوان خوبصورت، شوخ اور چنچل گلنار نہیں بلکہ ایک نہایت ہی ضعیف خاتون کھڑی ہے۔ جس کے بال برف کی طرح سفید اور چاندی کی طرح چمک رہے ہیں۔ چہرے پر جھریاں، آواز میں کپکپاہٹ اور کمر میں بڑھاپے کا خم ہے۔ "کیوں بڑی بی کیا آپ نے میری گلنار کو دیکھا ہے۔؟" "کون ارے پرویز تم آگئے!" وہ بوڑھی عورت پرویز کو تعجب خیز نظروں سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ اسے اپنی آنکھوں پر ایک دم یقین نہ ہوا۔ پھر اچانک وہ بے تحاشا پرویز کی طرف بڑھی اور اس سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "تم کہاں چلے گئے تھے پرویز؟ میں تمہارے انتظار میں بوڑھی ہو گئی۔" "ا... ا... ارے ارے یہ کیا کر رہی ہیں بڑی بی۔ آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟" "میں پرویز ضرور ہوں مگر آپ کا نہیں بلکہ اپنی گلنار کا ہوں۔" اس نے بوڑھی عورت کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ اس عورت نے پرویز کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھا اور طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر لاتی ہوئی بولی۔ "یہ تم کہہ رہے ہو پرویز۔ تم! جس کے وعدے پر اعتبار کر کے میں نے اپنی زندگی کو سراپا انتظار کر لیا۔ جس کے وعدے کا انتظار کر کے میں پچھلے پچاس سالوں سے ہر روز ہر حالت میں ٹھیک چار بجے یہاں آتی ہوں۔ سب کچھ بدل گیا مگر میری وفاداری میری وضع داری نہ بدلی۔ اور تم! اپنی لاحاصل تلاش و جستجو میں ایسے کھوئے کہ تمہیں نہ کسی کی یاد رہی نہ کسی کی پہچان، نہ کوئی احساس رہا نہ شعور ....!"

ارے تم تو آج بھی ویسے ہی جوان، خوبصورت، تندرست اور توانا ہو جیسے پچاس سال پہلے تھے۔ کمال ہے لباس بھی وہی ہے نہ پھٹا نہ میلا ہوا۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا تمہارا وقت زندگی کے کسی موڑ پر تھم گیا تھا؟ بتاؤ پرویز یہ ماجرا کیا ہے؟ گلنار نے حیرت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں شاید یہی ہوا ہوگا۔ میرا وقت تھم گیا ہوگا اور مجھے اس کا احساس نہ رہا ہوگا۔ اب اگر مجھے اس حقیقت کو تسلیم کرنا بھی پڑے کہ جو بھی میں نے دیکھا اور تم نے کہا درست اور صحیح ہے اور میں تم سے اور دنیا سے پچاس برس پیچھے رہ گیا ہوں.... تو مجھے اپنے ان پچاس سالوں کی تلاش کرنا ہوگی جو نامعلوم سے حالات میں غرق ہوئے... میں سوچتا ہوں... کیا زلزلہ کے بعد میں آرام کرسی پر بے حس و حرکت جھولتا رہا..... مجھے یاد آرہا ہے کہ زلزلہ سے ایک گول اور بڑا پتھر غار کے منہ پر آکر فٹ ہو گیا تھا۔ پھر غار کے اندر ہوا نہ رہی تھی اور میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ مگر اسی وقت میری ایجاد کردہ دوا کی بوتل زمین پر گر کر ٹوٹ گئی تھی اور اس کا عجیب و غریب مادہ غار میں پھیل گیا تھا۔ کیا یہ سب اسی کا ردِ عمل سے تھا؟ ہاں یہی ہو سکتا ہے۔ اس دوا نے اپنی تاثیر سے ہٹ کر دوسری شکل اختیار کرلی اور اس کے رد عمل سے جو چیز جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ میں بے ہوشی کے عالم میں تھا بے ہوش رہا۔ آرام کرسی ہل رہی تھی ہلتی رہی۔ فرش گیلا تھا گیلا رہا اور میری چائے گرم تھی گرم ہی رہی۔ پھر کسی نے غار کا منہ کھولا اور ہوا اندر داخل ہوئی اور اس کے ساتھ وقت بھی آیا اور وقت کے ساتھ زندگی۔ میری چائے گرم تھی مجھے لگا کہ یہ سب ابھی کی بات تھی۔....

...... ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی یہ بھی ہو جاتا ہے کہ کسی سائنٹسٹ کی کوئی ایجاد اس کی عقلِ سلیم اور محنتِ شاقہ کے باوجود بھی درکار اور متوقع انجام کو پہنچنے کے بجائے کوئی دوسری مگر اس سے بھی زیادہ اہم صورت اختیار کرلیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے گلنار۔ مگر یہ انسانی عقل سلیم سے کروڑوں گنا بڑھ کر قدرت کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ میں اس میں انسانی دخل نہیں مانتا۔ میں نے اسے کیا بنایا تھا قدرت نے اسے کیا بنا دیا۔ میری توقعات سے ہزار درجہ بہتر اور بڑھ کر۔ میرے کپ میں چائے گرم تھی گرم رہی

میری کرسی ہل رہی تھی ہلتی رہی۔ یہاں گھنٹوں کی بات تھی باہر پچاس سال گذر گئے۔ غار کے اندر کا وقت تھم گیا اور باہر زندگی کے دور اپنی راہ چلتے رہے۔ بڑھتے گذرتے رہے۔

یعنی قدرت کے لازوال اور لامحدود خزانے میں کرشموں کی کمی نہیں۔ اس وقت دنیا کا وقت تھم گیا تھا' یہاں چند لمحوں کی بات تھی۔ بستر یوں ہی گرم تھا۔ کنڈی یوں ہی ہل رہی تھی۔ اور وہاں آسمانوں میں صدیوں کا سفر لمحوں میں طے ہو گیا تھا۔

ہم سفر

نجیبہ حفیظ

وہ لمبی اور سونی سڑک پر اپنے ہی خیالوں میں گم چلی جا رہی تھی۔ اس کے لمبے گھنے بال نازک کمر پر رفتار کی تیزی کی وجہ سے ہر ہر قدم پر لہرا رہے تھے۔ صبح کا پُر فضا وقت تھا۔ بادِ نسیم کے نرم جھونکے اس کی زلفوں سے اٹھکھیلیاں کرنے لگے۔ ان سے تو وہ مسرور ہوتی رہی لیکن جیسے جیسے دھوپ چڑھتی گئی، ہوا بڑھتی گئی اور ہوا کے تند و تیز بدمست جھونکوں کی دست درازیاں بھی بڑھنے لگیں تو وہ اب ان کی گستاخیوں سے چیں بہ جبیں ہونے لگی۔ فوراً ہی اس کے ذہن میں ان جھونکوں کی گستاخیوں سے نجات پانے کی ایک ترکیب آئی۔ اس نے اپنے سارے بال دونوں ہاتھوں سے سمیٹے اور ایک خوبصورت سا جُوڑا بنا لیا۔ اب وہ مطمئن ہو کر پھر چلنے لگی۔

سورج کی تمازت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے اسے دوپہر ہو گئی اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اچانک اسے سڑک کے کنارے پھیلے ہوئے چھوٹے بڑے بنگلوں کے درمیان ایک چھوٹا سا لیکن خوبصورت بنگلہ نظر آیا جس کے سامنے ایک مختصر سا سرسبز و شاداب لان تھا۔ نہ چاہتے ہوئے اس کے قدم غیر محسوس طور پر اس بنگلے کی طرف بڑھنے لگے۔ اس نے آہستہ سے چھوٹا سا لوہے کا گیٹ کھولا اور کمپاؤنڈ میں داخل ہو گئی اس نے اندر کی طرف ایک ہی قدم بڑھایا تھا کہ اس کی نظر گلاب کی خوبصورت کیاری

میں لگے گلابوں میں سے ایک نہایت حسین اور دلکش بڑے سے سرخ گلاب پر پڑی۔ اور اسی میں الجھ کر رہ گئی۔ وہ تڑپ اٹھی اس پھول کو پانے کے لئے۔ ایسا ہی تو ایک پھول اسے اپنے جوڑے کے لئے چاہیئے تھا۔ وہ اسی پھول پر نظریں جمائے دوسری کیاریوں میں لگے پھولوں سے اپنے دامن کو بچاتی اور راستہ بناتی ہوئی اس پھول تک پہنچ گئی اور آہستہ سے جھک کر اس پھول کو سونگھا جیسے صرف اسی پھول کی خوشبو سونگھنا چاہتی ہو۔ جیسے ہی پھول پر جھک کر اس نے سانس لی اس کا دماغ معطر ہو گیا۔ پھول کی دلکشی تو اس کی نظروں میں پہلے ہی سما چکی تھی۔ اس نے سوچا یہ میرے جُوڑے کو چار چاند تو لگا ہی دے گا۔ پھر اس کی مسحور کن خوشبو کے سہارے یہ طویل سفر کتنا سہل ہو جائے گا اس نے پھول کو توڑنے کے لئے بڑے پیار سے ہاتھ بڑھایا۔ اچانک اسے کونٹ سا لگا۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ اور دیکھا تو ایک نکیلے کانٹے نے اس کی انگلی کو زخمی کر دیا تھا۔ خون کی ایک ننھی سی سُرخ بوند اس کی انگلی پر چمکنے لگی تھی۔ پھر اس نے اس پھول کی ٹہنی کو دیکھا جس میں اسے چھوٹے بڑے بے شمار کانٹے نظر آئے۔ اُن کانٹوں کی تیکھی نوکیں دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ لرز گئی۔ پھول کے حسن اور خوشبو نے اسے جتنا متاثر کیا تھا کانٹے اس سے بھی بازی لے گئے تھے۔

اُف! وہ ان کی سوئی سے بھی باریک نوکیں!! وہ ان کی خلش کو آنکھوں کے راہ سے دل میں محسوس کرنے لگی اور گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور سوچنے لگی۔

"نہیں میں اس پھول کو نہیں پا سکتی۔ آہ! کتنا تکلیف دہ ہوگا یہ میرے لئے۔ چھوتے ہی اس نے میرے ہاتھ کو زخمی کر دیا۔ جُوڑے میں لگتے ہی کیا یہ میرے دماغ کو زخمی نہ کر دے گا۔ میں بھی کیسی پاگل ہوں کہ پرائے لان کے پھول سے اپنے جُوڑے کو سجانے چلی تھی۔"

وہ اُلٹے قدموں واپس جانے لگی کیوں کہ پھول سے نظریں ہٹانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ اسی طرح چلتی ہوئی گیٹ تک آئی کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور پھول جھوم اٹھا جیسے اسے پھر بلا رہا ہو اور للچا رہا ہو۔ لیکن وہ ٹھوکر کھا کر سنبھل چکی تھی۔

اس نے ایک حسرت بھری نگاہ پھول پر ڈالی اور آہستہ سے اسی طرح گیٹ کو بند کر دیا اور سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح سونی لمبی سڑک پر چلنے لگی۔ کچھ ہی دور چلی تھی کہ اس کی کمر دھوپ کی تیزی سے تپنے لگی۔ وہ پریشان ہوگئی۔ "یا اللہ! کب میری منزلِ مقصود آئے گی" اور اس کے ذہن میں پھر اس پریشانی سے نجات پانے کی ایک ترکیب آئی اور اس نے جلدی سے اپنے جوڑے کو کھول دیا۔ اس کی گھنیری زلفیں پشت پر سایہ کئے ہوئے تھیں اور انھوں نے اسے دھوپ سے بچا لیا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ "چلو دونوں ہی مسئلے حل ہوگئے۔ کمر بھی دھوپ سے بچ گئی اور پھول سے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔"

یہ بوجھ ذہن سے اتر جانے پر وہ پُرسکون نظر آنے لگی اور... دور.. بہت دور افق کے پار۔ اس سڑک کے آخری کنارے تک پہنچ جانے کے لئے تیز تیز قدم بڑھانے لگی...... اب راہ پہلے سے بھی زیادہ ویران نظر آنے لگی۔ وہ چلتی گئی۔ چلتی گئی۔ لیکن یہ ویرانی اب اس کے پورے وجود کو ایک خوفناک اندھیرے غار میں تبدیل کرتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ گھبرا گئی......

اچانک اس نے محسوس کیا کہ جن خاروں کی کھٹک کے خوف سے وہ اس حسین ترین پھول کو چھوڑ آئی تھی وہی خار اب اس کے دل و دماغ کے نازک تر گوشوں میں کھٹک رہے ہیں۔ اس نے سوچا۔ "چلو اس سنسان راہ میں کوئی تو ہم سفر ملا۔ اب اس خلش کے سہارے میرے لئے اس راہ کو طے کرنا زیادہ سہل ہوگا۔"

———— ※ ————

چوری

مختار الرحمٰن راہی

"بابو جی!"

وہ اپنا ہاتھ پھیلائے صورتِ سوال کھڑی تھی۔

"کیا چاہتی ہو؟"

مہیش نے اسے از سرتاپا بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نئے پیسے بابو جی!"

اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کی بے نور آنکھوں میں التجا تھی۔

"کیا کرو گی؟"

مہیش نے پھر سوال کیا۔

"بہت بھوک لگی ہے۔ چنے خرید کر پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کروں گی۔" اس کی آواز میں نقاہت تھی۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔

"تم میرے گھر کا کام کرنا پسند کرو گی؟" مہیش کی آواز میں خلوص تھا۔ ہمدردی تھی۔ "وہاں تمہیں دونوں وقت کھانے کو ملے گا اور پہننے کو کپڑا۔ اس کے علاوہ حسبِ ضرورت کچھ روپیہ بھی۔"

"گھر میں بی بی جی ہیں؟"

اس کی آنکھوں میں اندیشہ اور بے اعتباری کی جھلک تھی۔

"ہاں!" مہیش نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہیں!
"مگر ـــــــ"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"بولو تمہاری کوئی شرط ہے؟" مہیش نے کہا۔ "یوں گھر میں زیادہ کام بھی نہیں اور اگر مہمان زیادہ آنے لگتے ہیں تو ہماری شریمتی جی ان کی دعوت کسی ہوٹل میں کرنے کا انتظام کر دیتی ہیں۔ تاکہ ملازم کام سے گھبرا کر چلا نہ جائے۔"

"میں کام سے نہیں گھبراتی۔" وہ بولی۔ "بی بی جی کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟" اس کی پیشانی پر سوالیہ لکیریں پھیل گئیں۔

"انھیں بہت دنوں سے ایک ملازمہ کی تلاش ہے۔" مہیش بولا۔ "اور پھر تمہیں ملازم رکھنے میں بھلا اُنھیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"تو میں تیار ہوں بابو جی!"

اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

اور مہیش اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

اس کا نام تو شکنتلا تھا۔ لیکن لوگ اسے شکُن کہا کرتے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے والدین کون ہیں۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو جے پور کے فٹ پاتھ پر کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے ہوئے پایا۔ بچپن ہی سے اس نے بھیک مانگ کر پیٹ پالنا سیکھا تھا۔ دن بھر رام گنج بازار، ترپولیا بازار اور مرزا اسمٰعیل روڈ پر ہاتھ پھیلائے گھومنا اور رات کو "بے کاروں کے مسکن" کے سامنے فٹ پاتھ پر پڑ رہنا اس کی زندگی کا معمول تھا۔ جب اس نے بچپن کی سرحد کو پار کر کے جوانی اور شباب کے لالہ زار میں قدم رکھا، تو بہت سی پیاسی اور للچائی نظروں کو اپنی طرف ملتفت پایا۔ وہ ان عجیب سی نظروں کے پیغام کو سمجھ نہ سکتی تھی۔ جب کوئی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا تو وہ گھبرا کر اپنی نظریں جھکا لیتی تھی۔ اور جب کوئی اسے پیسہ دیتے وقت اس کا ہاتھ یا انگلی زور سے دبا دیتا تھا تو وہ اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیتی تھی۔ اور کبھی کبھی وہ پیسہ اس کی طرف حقارت سے پھینک کر آگے بڑھ

جاتی تھی۔ اسے اپنی اس زندگی سے نفرت تھی۔ وہ اس تاریک اور گھناؤنے ماحول سے نکلنا چاہتی تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی ہمدرد اور مخلص ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھا تھا۔ ہر طرف بھوکی اور اس کا سب کچھ لوٹ لینے والی نظریں اس کے تعاقب میں تھیں۔ اور وہ ان سب نظروں سے بچتی ہوئی بھکارن کے نام کا حقارت آمیز طوق اپنی گردن میں ڈالے زندگی گزار رہی تھی۔ وہ اکیس سال کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ مگر فاقوں کی وجہ سے اس کے رخسار کمھلائے ہوئے تھے۔ آنکھیں بے نور تھیں۔ چہرے کی رنگت پیلی تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ جسم لاغر تھا۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹی ہوئی وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت معلوم ہو رہی تھی۔

مہیش کی بیوی ساوتری نے شکنتلا کو ٹھوک بجانے والی نظروں سے دیکھا۔

"تم کھانا پکانا جانتی ہو؟"

ساوتری نے پوچھا۔

"جی بی بی جی!" اس نے نظریں جھکائے جواب دیا۔

"اس سے پہلے کہیں کام کر چکی ہو؟"

"جی نہیں۔"

اس نے آہستہ سے جواب دے کر ساوتری کی آنکھوں کی طرف بے چینی سے دیکھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسے ملازم نہ رکھے۔

"اگر تم نے کام ڈھنگ سے کیا تو رکھا جائے گا۔ ورنہ........"

"بہت بہتر!" وہ جلدی سے بولی۔ "میں اپنی طرف سے کسی شکایت کا موقع نہ دوں گی۔"

اور شکنتلا نے کام شروع کر دیا۔

صبح اٹھ کر وہ نہانے کے لئے پانی گرم کرنے کے بعد چائے تیار کرتی اور پھر ساڑھے نو بجے مہیش کے لئے کھانا پکاتی۔ اور جب وہ دفتر جاتا تو جوتوں پر پالش کرتی۔ دوپہر کو ساوتری کے کپڑے دھوتی یا پھر ان کی اکلوتی لڑکی نرملا کو کھلاتی۔ شام کو جب مہیش دفتر سے

آتا تو ناشتہ تیار کرتی۔ اور اس کے بعد رات کا کھانا۔ اسی طرح وہ صبح سے رات کے ۹ بجے تک مشین کی طرح کام میں لگی رہتی تھی۔

مہیش شکنتلا کے کام سے بہت خوش تھا۔ ساوتری نے بھی اس کے کام کے متعلق مہیش سے کوئی شکایت نہ کی۔

ایک ہی مہینے میں شکنتلا بالکل بدل گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی تھی۔ رخسار تمتما اٹھے تھے۔ چہرے پر زردی کی بجائے گلاب کی سُرخی رس بس گئی تھی۔ اب وہ ادھیڑ عورت نہیں رہی تھی۔ بلکہ ایک نوجوان الہڑ لڑکی تھی۔ اس کی چال میں مستی آگئی تھی۔ اس کی آواز میں غنچوں کی چمک تھی۔ اس کے ہونٹوں پر دلکش تبسّم رقصاں تھا۔ جب وہ مہیش سے باتیں کرتی تب بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں رہتی تھی۔ کبھی سر سے دوپٹہ ڈھلک جاتا تو وہ سر نہیں ڈھکتی تھی۔ وہ اسی طرح گنگناتی ہوئی کام میں منہمک رہتی تھی۔ ساوتری کو شکنتلا کی یہ حرکتیں کبھی کبھی ناگوار گزرتیں مگر اس نے کبھی مہیش سے اس کا تذکرہ نہیں کیا اور نہ شکنتلا کو ڈانٹا۔

ایک رات شکنتلا مہیش کے لئے دُودھ لے کر گئی۔ وہ کمرے میں بیٹھا ہوا کسی فائل میں کھویا ہوا تھا۔

"بیٹھ جاؤ ڈارلنگ!" مہیش نے قدموں کی آہٹ سُن کر کہا۔ "آج میں دُودھ نہیں پیوں گا۔ تم پی لو۔"

مہیش کی نظریں اسی طرح فائل پر گڑی ہوئی تھیں۔

"دُودھ پی لیجئے۔"

شکنتلا نے نیچی نظریں کئے آہستہ سے کہا۔

"اوہ! یہ تم ہو شکن۔" مہیش نے شکنتلا کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "آج تمہاری بی بی جی دُودھ نہیں لائیں؟"

"جی وہ پڑوس میں گئی ہوئی ہیں۔"

شکنتلا کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی تھی۔

"اچھا تو یہ دُودھ تم پی لو۔" ہیش نے کہا۔
"نہیں بابو جی، یہ آپ کے لئے ہے۔"
شکنتلا کی آواز میں ہچکچاہٹ تھی۔ ایک انجانا خوف تھا۔
"میں جو کہہ رہا ہوں۔" ہیش نے مصنوعی غصے سے کہا۔
دفعتاً شکنتلا نے دیکھا۔ ساوتری کی آنکھیں کھڑکی کے شیشے سے جھانک رہی تھیں۔ شکنتلا کا ہاتھ جس میں دُودھ کا گلاس تھا کانپنے لگا۔ اور وہ دُودھ کا گلاس وہیں میز پر رکھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ ساوتری نے شکنتلا کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ شکنتلا سہم گئی۔ وہ گردن جھکائے کھڑی تھی۔
"یہاں بُت بنی کیوں کھڑی ہے، جا اپنا کام کر!"
ساوتری نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔
اور وہ بھاری بھاری قدموں سے رسوئی میں برتن صاف کرنے چلی گئی۔

دن کروٹ بدلتے رہے۔
شکنتلا اپنا کام ہوشیاری اور دلچسپی سے کرتی رہی۔ چھ مہینوں میں اس نے ساوتری یا ہیش کو اپنے کام کے متعلق شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔
ایک دن ہیش جب دفتر سے آیا تو اس کے سر میں درد تھا اور معمولی سی حرارت۔ مگر رات کو تیز بخار ہو گیا۔ ساوتری اس کے پیر دبا رہی تھی۔ اور شکنتلا سر کی مالش کر رہی تھی۔ دونوں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ دونوں کے چہروں پر فکر کی گہری لکیریں نمایاں تھیں۔ ہیش کے کراہنے کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ جب ساوتری تھک گئی تو وہ ہیش کے برابر والے پلنگ پر لیٹ گئی اور شکنتلا کو ایک گھنٹہ بعد دوا پلانے کی تاکید کر دی۔ شکنتلا ہیش کے پیر دبانے لگی۔ ایک گھنٹہ بعد جب اس نے ہیش کو دوا پلانے کے لئے جگایا تو وہ چونک پڑا
"دوا پی لیجئے۔"
شکنتلا نے شیشی سے گلاس میں دوا ڈالتے ہوئے کہا۔

مہیش نے دوا حلق میں اتارتے ہوئے برا سا منھ بنایا اور پھر لیٹ گیا۔ اس کی نظریں ساوتری پر پڑیں جو پلنگ پر محوِ خواب تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے بابو جی؟"

شکنتلا نے آہستہ سے پوچھا۔

"میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔" مہیش شدتِ کرب میں چلّایا۔

"بی بی جی کو اٹھاؤں، وہ آپ کا سر دبا دیں گی؟"

شکنتلا نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "انھیں سونے دو۔ تم ہی میرا سر دبا دو۔"

اور شکنتلا مہیش کا سر دبانے لگی۔

اس کے دونوں ہاتھ مہیش کے سر پر آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ شاید مہیش کو اس سے سکون ملا۔ کیوں کہ کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں تھا۔ شکنتلا اس کا سر دباتی رہی۔ نہ جانے کب تک اس کی نازک انگلیاں مہیش کو تھپک تھپک کر سلاتی رہیں۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو ساوتری اسے مہیش کے پلنگ سے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ رہی تھی۔ مہیش جو ابھی تک سویا ہوا تھا، اٹھ بیٹھا تھا۔ شکنتلا گھبرا کر اٹھ گئی۔ اسے خیال آیا وہ مہیش کا سر دباتے دباتے وہیں لڑھک کر سو گئی تھی۔

ساوتری کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ شکنتلا کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھیں خوف اور ہراس سے پھٹی ہوئی تھیں۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔"

شکنتلا گڑگڑائی۔

"جاؤ اپنا کام کرو!"

ساوتری نے حلق پھاڑ کر کہا۔

"اتنی ناراض کیوں ہوتی ہو؟" مہیش نے کہا۔ "وہ بھی تو آخر انسان ہے۔ نہ جانے کب تک بے چاری میرا سر دباتی رہی ہوگی۔ اور پھر....."

اور ساوتری اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔

مہیش تندرست ہو چکا تھا۔ حالات معمول پر آ گئے تھے۔ شکنتلا دن بھر محنت سے اور دل لگا کر کام کرتی رہی۔ یہ اور بات ہے کہ فرصت کے اوقات میں وہ کچھ دیر آئینے کے سامنے کھڑی رہتی تھی۔ اور کبھی کبھی گنگنا بھی لیا کرتی تھی۔

جب مہیش اس کے کام کی تعریف کرتا تو ساوتری بغیر کوئی جواب دئے وہاں سے چلی جاتی تھی۔

ایک شام کو ساوتری جب مہیش کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی تھی تو اس نے مہیش سے کہا۔

" تعجب ہے نہ جانے میری رسٹ واچ کہاں گئی۔ کل ہی میں نے سوٹ کیس میں رکھی تھی۔ "

" اچھی طرح سے الماری اور ٹائلٹ بکس میں دیکھو۔ " مہیش نے بے پروائی سے کہا۔

" میں کئی کئی بار سب جگہ تلاش کر چکی ہوں۔ " ساوتری نے جواب دیا۔ " آج تک کوئی چیز نہیں کھوئی۔ اور اب سوٹ کیس سے گھڑی غائب ہو گئی۔ " ساوتری شکنتلا کی طرف شک کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

" تم نے کہیں دیکھی ہے؟ "

مہیش نے شکنتلا سے پوچھا۔

" نہیں بابو جی! "

شکنتلا نے نفی میں گردن ہلائی۔

" تو پھر کہاں گئی گھڑی؟ "

ساوتری نے غصے سے کہا۔

" میں کیا جانوں؟ " شکنتلا نے کہا۔ " میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ "

اچھا تم اسے گھر میں اچھی طرح تلاش کرنا۔ ہم اس وقت جا رہے ہیں۔ " مہیش

نے باہر جاتے ہوئے کہا۔
"گھڑی ملنی ہی چاہئے۔"
ساوتری بولی۔
اور وہ دونوں چلے گئے۔
شکنتلا شش و پنج کی حالت میں کھڑی رہ گئی۔
فلم دیکھ کر جب وہ واپس آئے تو مہیش نے پوچھا۔
"گھڑی ملی؟"
"جی نہیں۔" شکنتلا کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "میں سب جگہ تلاش کر چکی ہوں۔"
"اگر گھڑی نہ ملی تو ہمیں تمہارے ساتھ مجبوراً سختی کرنی پڑے گی۔"
ساوتری نے غصّے میں کہا۔
شکنتلا نے گردن جھکا لی۔

دو دن بعد ....
ساوتری نے مہیش سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
"آج میرے بکس سے پچاس روپے غائب ہیں جو میں نے پریمیم کے لئے رکھے تھے۔"
مہیش نے شکنتلا کی طرف گھور کر دیکھا۔
"یہ آج کل نئی نئی باتیں سنائی دے رہی ہیں۔ آخر کیا بات ہے؟ میں نے تمہاری مدد اس لئے تو نہیں کی تھی کہ ...."
"بابو جی! مجھ پر وشواس کیجئے۔ میں نے روپے نہیں لئے۔" شکنتلا نے گڑگڑا کر اپنی صفائی پیش کی۔
"تو پھر آخر کون لے گیا؟"
مہیش کی آواز میں سختی اور تلخی تھی۔
"میں خود حیران ہوں۔" وہ بولی۔

"یہ اس طرح باز نہیں آئے گی۔ اسے پولیس کے حوالے کر دو۔"
ساوتری نے دھمکی دی۔
"ایسا نہ کیجئے بی بی جی!" شکنتلا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے التجا کی۔
"یا تو تم کھوئی ہوئی چیزیں لا کر دے دو۔ ورنہ تمھیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"
ساوتری نے پھر سختی سے کہا۔
شکنتلا کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ اس کے چہرے سے ذہنی کشمکش کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ شدتِ غم سے اس کے آنسو نکل پڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب اقبالِ جرم کر کے معافی مانگ لے گی۔ اچانک اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔
"بی بی جی! میں آج ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔ میرے دل میں کبھی آپ کے اور مہیش بابو کے پیار کے درمیان دیوار بننے کا خیال تک نہیں آیا۔ مہیش بابو دیوتا ہیں۔ انھوں نے مجھے سہارا دیا...... میں بھکارن ضرور ہوں لیکن چور ہرگز نہیں..... مجھے امید ہے میرے چلے جانے کے بعد آپ کو آئے دن قیمتی چیزوں کے غائب ہونے کی شکایت نہیں رہے گی ——— میں جا رہی ہوں بابو جی! ہم بھکاریوں کے لئے فٹ پاتھ ہی مناسب جگہ ہے ——— اور اگر کوئی فٹ پاتھ کی زندگی چھوڑنا بھی چاہے تو دنیا اسے چین نہیں لینے دیتی۔"
شکنتلا یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اور مہیش ساوتری کی طرف تحیر آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا ——— وہ گردن جھکائے اس طرح کھڑی تھی جیسے اس کی چوری پکڑ لی گئی ہو ———!!

———※———

شاخسانہ

مختار ٹونکی

اس نے بیڑی کا آخری کش لیا اور سر اٹھا کر سامنے نظر دوڑائی۔ معمول کے مطابق وہی پرانا منظر اس کا منھ چڑا رہا تھا۔ ایک ہولناک سناٹے اور اذیت ناک خاموشی کا منظر جس میں نہ کوئی جاذبیت تھی اور نہ کوئی دلکشی۔ قبرستان کی دیوار کے اُس طرف دور دور تک سیکڑوں قبریں اس کے پیشِ نظر تھیں۔ چھوٹی بڑی قبریں، خام اور پختہ قبریں، ثابت و سالم اور شکستہ و منہدم قبریں، کچھ نئی اور پرانی قبریں، بھلا! اس نظارے سے کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ تھوڑا دلی اطمینان اور فرحت کا احساس اُسے تب ہوتا تھا جب کسی نئی قبر کے اضافے کی خبر اُسے ملتی تھی۔ برسوں سے اس کا یہ وطیرہ بن گیا تھا کہ وہ چائے ناشتے سے فارغ ہو کر صبح آٹھ بجے اپنے مکان کے باہر چبوترے پر چارپائی ڈال لیتا تھا اور پھر انتظار کی اذیتوں کو جھیلتا تھا۔

اس کے مکان اور قبرستان کے بیچ صرف ایک سڑک تھی جو غیر آباد سی لگتی تھی۔ جب کوئی جنازہ آتا تھا تو تھوڑی بہت آمد و رفت ہو جاتی تھی۔ اس نے بائیں طرف دیکھا۔ سڑک پوری طرح سنسان تھی۔ آدم و آدم زاد تو کیا کوئی چڑیا کا بچہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ قبرستان کے سراسیمہ ماحول نے سڑک کو بھی ویرانی اور سراسیمگی بخش دی تھی۔ چاروں طرف ایک ہو کا عالم طاری تھا۔ اس کی بے چین نظریں جس چیز کی متلاشی تھیں اس کی بازیافت غیر یقینی تھی تاہم ایک موہوم سی امید کے سہارے وہ اپنے ذہنی

تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ انتظار میں موت سے بھی زیادہ شدت ہوتی ہے' ہاں اسے موت کا انتظار رہتا تھا' کسی کی موت واقع ہونے یا فوت ہو جانے کی خبر سن کر اس کا دل مسرّت سے ناچ اٹھتا تھا کیوں کہ اسی کے ذریعہ وہ روزی روٹی کماتا تھا۔ اس کا پشتینی پیشہ گورکنی تھا اور پچھلے پچیس[25] برسوں سے وہ متواتر قبریں کھودتا آرہا تھا۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں مُردے اس کی کھودی ہوئی قبروں میں ابدی نیند سو رہے تھے۔

دھوپ زیادہ چڑھ آئی تھی اور ویسے بھی اس کی طبیعت مکدّر تھی۔ اس نے بے دلی سے چارپائی اٹھائی اور مکان کے ڈیوڑھی میں لے جاکر بچھادی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ مسلسل پندرہ[15] دن اس کے لئے "ڈرائی ڈے" ثابت ہوئے تھے۔ یہ حیرت اور دُکھ کی بات تھی کہ شہر میں کوئی زندہ مردے میں تبدیل نہیں ہوا تھا اور اس کا نصف مہینہ عجیب گومگو کی حالت میں گذرا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ روزانہ لوگ مرتے رہیں تاکہ اُس کی معاش کے اسباب بھی ہوتے رہیں۔ اس نے ڈیوڑھی میں پڑے ہوئے کدال پھاوڑے کو جھنجھلا کر ایک ٹھوکر ماری اور پھر مکان کے اندرونی حصّے میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی دونوں بچیاں اور بیوی بیڑیاں بنانے اور پتّہ کاٹنے میں مصروف تھیں۔ اگر صرف گورکنی کو ہی وہ اپنا مقدر سمجھ لیتا تو اس کی گرہستی تباہ و برباد ہو گئی ہوتی۔ بیڑی کے دھندے نے کم سے کم انھیں فاقوں کی نوبت تو نہ آنے دی تھی۔ چند لمحے انہماک سے وہ اپنے بیوی بچوں کو دیکھتا رہا۔ پھر چارپائی پر دری بچھا کر لیٹ گیا۔ کچھ ذہن نارمل ہوا تو مختلف خیالات کلبلانے لگے .... گذشتہ سال جب شہر میں الٹی دست کی بیماری نے تباہی مچائی تھی تو اس کے لئے قبریں کھودنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک ایک دن میں دس دس بارہ بارہ قبریں کھودنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ مجبور ہوکر اسے اپنے بیٹے کو بھی اس کام میں شریک کرنا پڑا تھا .... اس کا بیٹا عبدالکریم بہت ہونہار اور فرماں بردار تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی گورکنی کا موروثی پیشہ اپنائے۔ اُس نے بہ ہزار دقت اپنے بیٹے کو خوب پڑھایا لکھایا تھا۔ بی۔ اے۔ کرنے کے بعد وہ نوکری کی

تلاش میں لگا ہوا تھا۔ کچھ چھوٹی کلاسوں کی ٹیوشن بھی اُس نے پکڑ رکھی تھی ....
اس وقت وہ گھر میں نہیں ہوگا۔ صبح سائیکل پر اس کے سامنے تو گیا تھا........ بڑی بچّی ایک دو سال میں سنِ بلوغ کو پہنچ جائے گی۔ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے بھی سے ابھی سے کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ کاش! عبدالکریم کی نوکری جلدی کہیں لگ جائے۔
.... قبریں کھودنے کی آمدنی سے بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ ایک زمانہ تھا جب وہ قبر کھودنے کی اجرت صرف پانچ روپے لیتا تھا اور اس ریکارڈ توڑ مہنگائی میں اسے "ہنڈریڈ" مانگنے پڑتے ہیں .... یہ ملک الموت بھی بڑا ستم ظریف ہے۔ جب لوگوں کے روح قبض کرنے پر آتا ہے تو وقت بے وقت درجنوں کو اپنا شکار کر بیٹھتا ہے اور ہفتوں اسی سلسلے کو جاری رکھتا ہے۔ بعض دفعہ تو اسے راتوں کو بھی قبریں کھودنا پڑی ہیں اور اب دیکھو پندرہ دن سے لاپتہ ہے۔ نہ جانے کہاں ڈیوٹی انجام دے رہا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ یہاں کسی کی جان پر بنی ہوئی ہے .... اب ملک الموت بھی کیا کرے؟ یہ ڈاکٹر لوگ بھی بڑے عجیب ہیں۔ فضول جاں بلب اور قریب المرگ مریض کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرنے کیوں نہیں دیتے کہ جھنجھٹ مٹے۔ ایک آدمی مُردے کے انتظار میں ہمہ تن چشم بنا بیٹھا ہوا ہے اور اُدھر گلوکوز چڑھا کر آکسیجن سپلائی کر کے اور پُر قوت انجکشن ٹھونس کر اس کی امیدوں کو خاک میں ملایا جا رہا ہے .... تعجب ہے! اتنے دنوں سے شہر میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور کیا کر رہے ہیں؟ کیوں دو چار کو کچل نہیں دیتے؟ آخر اسے بھی تو جینے کا اختیار ہے۔ وہ قبریں کھودنے کا تکلیف دہ اور مشکل کام کرتا ہے اور محنت و مشقّت کر کے اپنا خون پسینہ بہاتا ہے۔ حرام خوری تو نہیں کرتا۔ بھیک تو نہیں مانگتا .... کوئی عمارت ڈھے کیوں نہیں جاتی؟ کوئی دیوار گر کیوں نہیں جاتی؟ تاکہ دو چار تو مریں اور پھر یہاں آکر پیوندِ زمین ہوں .... بنگلہ دیش میں طوفان آرہے ہیں .... کہیں زلزلے اُدھم مچا رہے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ لقمۂ اجل ہو گئے۔ شاید ملک الموت مع اپنی ٹیم کے وہاں پہنچ گیا ہے۔ مفت میں وہاں موت کا ننگا ناچ ہو رہا ہے۔ یہاں کچھ ایسا ہو تو کسی کو کچھ فائدہ پہنچے .... چھ مہینے پہلے

ایک زیرِ تعمیر بلڈنگ کی چھت بیٹھ گئی تھی تو بیسیوں راج مزدور دب کر مر گئے تھے۔ متعلقہ انجنیر کو ناقص میٹیریل استعمال کرنے کی وجہ سے موردِ الزام ٹھہرایا گیا تھا مگر اسے تو یک گونہ مسرت کا احساس ہوا تھا۔ کچھ گھریلو معاشی مسائل حل ہو گئے تھے ....
پنجاب میں خوف و دہشت کا بازار گرم ہے۔ جمّوں اور کشمیر کا علاقہ قتل و خون کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ کہیں نکسل وادی اپنی جارحانہ سرگرمیاں تیز کئے ہوئے ہیں تو کہیں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے مسئلے نے شورش برپا کر رکھی ہے.......... یہ کیسا شہر ہے؟ یہاں گڑبڑ کیوں نہیں ہوتی؟ یہاں بھی تو مختلف فرقوں کے لوگ رہتے ہیں پھر بھی دنگا فساد نہیں ہوتا۔ لوٹ مار اور مار کاٹ ہو تو کچھ لوگوں کی جانیں جائیں اور اسے بھی مواقع نصیب ہوں .... یہ ضرور ہے کہ شہر کے حالات اطمینان بخش نہیں ہیں۔ کشیدگی پھیلی ہوئی ہے اور تعصب و منافرت نے اپنی جڑیں پوری طرح جما رکھی ہیں مگر انتظامیہ نے دور اندیشی سے کام لے کر دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی ہے۔ شرارت پسند عناصر پر کڑی نظر ہے۔ ایسے میں کیا ہو سکتا ہے؟ ....

— "ابو جی کھانا کھا لیجئے" اپنی چھوٹی بچی ریحانہ کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ اُس کے خیالات کو ایک جھٹکا سا لگا۔ آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتے کرتے ایک دم وہ جیسے زمین پر اتر آیا ہو۔ کیسے کیسے بُرے خیالات اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ اس کو اپنے سوچ کے اس منفی انداز پر سخت تعجب ہوا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے سر کو کئی بار دائیں بائیں گھمایا۔ شاید اس طرح وہ اپنی ذہنی کجروی کو جھٹک دینا چاہتا تھا۔ کہیں اس کی بیٹی اس کے خیالات نہ پڑھ لے۔ اُس نے اُس سے بغیر نظریں ملائے کھانے کی تھالی اپنے ہاتھوں پر سنبھال لی۔ دوپہر ہو گئی تھی اور ضروریاتِ زندگی کا یہ فریضہ بھی اسے انجام دینا تھا۔

اس کی بیوی کھانا نہایت سلیقے سے بناتی تھی۔ اُس نے خوب شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔ ہاتھ منہ دھوتے وقت وہ سوچ رہا تھا کہ رخسانہ کتنی صابر و شاکر عورت ہے۔ تنگدستی میں بھی خوش و خرم نظر آتی ہے۔ سخت سست وقتوں میں بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی اور نہ کبھی اپنے دُکھ کا اظہار کیا۔ اسے نہ دنیا کی پروا ہے اور نہ دنیا والوں کی۔ اپنے حال

میں مست و مطمئن ہے۔ ابھی وہ چارپائی پر بیٹھ کر بیڑی سلگانے ہی جا رہا تھا کہ باہر سے آواز آئی۔

"رحیمو چاچا! ..... رحیمو چاچا! جلدی سے باہر آئیے۔"

آواز میں سراسیمگی و بے چارگی تھی۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آیا۔ اُس کے سامنے مسیتا کھڑا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ منہ فق تھا اور اُس کا سینہ دھونکنی کی طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دور سے بھاگتا ہوا آیا ہے۔

"کیا غضب ہو گیا مسیتے؟ کیوں چلاّ رہا ہے"؟ اس نے پوچھا۔

کچھ نہیں چاچا! ...... وہ .... کریمو ہے نا کریمو .... مسیتا کہتے کہتے رُک گیا۔

"کیا ہوا میرے بیٹے کو؟ کہاں ہے وہ؟ اُس کے لہجہ میں فکرمندی آگئی۔

"چاچا! .... وہ جلیبی چوک میں دنگا ہو گیا ہے ..... بازار کی سب دکانیں بند ہو گئیں ...... کریمو ادھر سے آ رہا تھا کہ چند غنڈوں نے اسے گھیر لیا اور اُس کے پیٹ میں چاقو گھونپ دئے .... اس کی لاش پولیس لے گئی۔ آپ جلدی سے چلیں۔"

یہ دہشت ناک خبر سن کر وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اس پر سکتہ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ چند لمحے خالی خولی نظروں سے مسیتے کو دیکھتا رہا اور ہونٹوں میں بڑبڑایا۔

"دنگا ... لاش! ..... مُردہ .... اللہ تو مسبّب الاسباب ہے" پھر خاموشی سے اُس نے کدال پھاوڑا اٹھایا اور میکانکی انداز میں قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُسے قبر جو کھودنا تھی اپنے بیٹے کی ...... پیارے بیٹے کی۔

آوازوں کا جنگل

مشکور جاوید

مجھے اپنی بستی سے بہت پیار ہے۔ یہ بستی رام کالونی کہلاتی ہے کیوں کہ شریف لوگوں کی نظر میں یہاں بدمعاش لوگ رہتے ہیں۔ اور جو چیز ایک بار برائی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے وہ ظاہر ہے کہ لوگوں کی نظروں میں جلد آجاتی ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو یہ بستی شہر میں تھوڑی بہت مشہور ضرور ہے۔

جب بھی تھکا ہارا اپنے گھر کو لوٹتا ہوں تو اس بستی میں پھیلا ہوا آوازوں کا جنگل مجھے اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ دن رات اس جنگل میں پھیلی ہوئی آوازوں کو سن سن کر میں اس کا عادی ہو گیا ہوں۔

جب میں اس بستی میں آیا تھا تو میں نے دو ہی دن بعد یہاں سے چلے جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ دو دن بڑھتے بڑھتے دو مہینے میں تبدیل ہو گئے اور پھر یہ مہینے برسوں میں۔

اب یہ حالت ہے کہ اگر بستی میں پھیلا ہوا آوازوں کا جنگل کبھی خاموش ہو جاتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے کسی نے بُت بنا دیا ہو۔ ایک طرح کا خالی پن اور کسی بات کی کمی کا مجھے احساس ہونے لگتا ہے۔

آج آفس کی چھٹی تھی اور میں خوش تھا کہ کم سے کم آج تو صاب کا سگار ٹائپ چہرہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ کمرے میں بیٹھا ہوا اس ساترے کا ناول "دی وال" پڑھنے میں لگا

تھا۔ بستی میں پھیلا ہوا آوازوں کا جنگل پھیلتا ہی جارہا تھا۔ ناول ختم کرنے کے بعد۔ اور کچھ کرنے کا موڈ نہیں بنا تو سوچا اس جنگل میں پھیلی ہوئی آوازوں کو سن لیا جائے۔ لیکن یہ آوازیں کچھ صاف سنائی نہیں پڑ رہی تھیں۔ کمرے کی کھڑکی کھولتے ہی یہ آواز کا جنگل بڑی تیزی سے میرے کمرے میں گھسنے لگتا ہے۔

نل پر برتنوں کی ملی جلی کھڑکھڑاہٹ اور کچھ آوازیں میرے کانوں میں گھس جاتی ہیں۔

اپنا یہ گھڑا ہٹا' ورنہ پھوڑ ڈالوں گی' بڑی آئی پہلے پانی بھرنے والی۔

دیکھو زینت منھ کو لگام دو۔

ارے تو کیا کرے گی' خصم سے کہہ کر جوتے نہ کھلوا دوں تو میرا نام نہیں۔

میں تو تجھ جیسی چھنال کے منھ لگنا نہیں چاہتی۔

مجھے چھنال کہتی ہے' تجھے بتاؤں۔

پھر برتنوں کے لڑھکنے کی آوازیں......

ارے ...... ارے .... چھوڑ دے زینت تو تو بڑی ہے۔ کیوں بچپنا کرتی ہے۔

تو چپ رہ بڑی آئی سمجھانے والی۔

کھٹاک ......

دھم ......

بچاؤ ......

چھنال' آوارہ' تیرا خون پی لوں گی۔ ....

ارے چھوڑو .... نل بند ہو جائیں گے ...... بعد میں نمٹ لینا ....

یہ کیا روز روز

سُور کے بچے نل والے۔ ......

پھر ایک طویل خاموشی اور پانی بھرنے کی آواز۔

میری نظر کریم ٹیلر پر جم جاتی ہے۔ وہ سامنے والی گلی سے ہوتا ہوا اپنے گھر میں چلا

جاتا ہے۔ اور کچھ ہی دیر بعد اس کے گھر میں ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔

میں زہر کھا لوں گی...... حرامزادے نکل جا یہاں سے......

سالی..... تیرے میں تمیز بھی ہے یا نہیں........ تو کیوں میرا گھر برباد کرنے پر تل گئی ہے۔ میں تجھے بھی جان سے مار ڈالوں گا۔

تو مجھے مارے گا......

چٹاخ.......

ہائے مار ڈالا' تیری قبر کھود دوں ناس پیٹے....... خدا تجھے غارت کرے۔

کچھ لوگوں کی بھیڑ کریم ٹیلو کے گھر پر جمع ہو جاتی ہے۔ بھیڑ میں سے ایک آواز —

"تجھے شرم نہیں آتی جورو پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔"

تم کون ہوتے ہو ہمارے بیچ میں بولنے والے۔ سالی تجھ پر جوتا اٹھاتی ہے۔ دیکھتا ہوں تجھے کون بچاتا ہے۔

اب مار کے دیکھ تو

طلاق دے دوں گا۔

دے۔ دے طلاق۔ ویسے بھی تیرے پاس تجھے کون سا سُکھ ہے۔ روز جانور کی طرح کھسوٹتا ہے۔ اور کچھ نہیں کر پاتا۔

نامرد! مجھے ایک بچہ بھی دے سکا ہے تو.......

اور پھر کریم لکڑی لے کر پل جاتا ہے۔ لوگوں کے بیچ بچاؤ کرنے کی آوازیں' کریم ٹیلو بنا روٹی کھائے ہوئے گھر سے نکل جاتا ہے۔

گلی کے نکڑ کے بالکل پاس ہی برجو کا گھر ہے۔ گھر کیا ہے بس چاروں اور مٹی کی سات۔ آٹھ فٹ اونچی ایک دیوار بنی ہوئی ہے۔ چھت کی جگہ پر آدھی دیوار تک لکڑی کے تختے رکھے ہوئے ہیں۔ بارش کے دنوں میں اکثر اس کی بیوی ان دیواروں کی لیپا پوتی کرتی دکھائی پڑتی ہے۔

شام ہوتے ہی پوری بستی میں دھواں پھیلنے لگتا ہے۔ لیکن میں کبھی کبھی ہی برجو کے گھر

میں دھواں اٹھتا ہوا دیکھتا ہوں۔ اور جب بھی اس کے گھر سے یہ دھواں اٹھتا ہے تو بچوں کے تیز بولنے کی آوازیں مجھے سنائی پڑنے لگتی ہیں۔

ماں .... ماں .... کالو نے میری روٹی لے لی۔

دے کالو .... ورنہ ماروں گی .... بھاگ پھوٹ گئے۔ میرے جنم جلوں کا ایک ایک روٹی میں بھی پیٹ نہیں بھرتا۔

پھر کچھ ہی دیر بعد بچے باہر نکل کر روٹی کھاتے کھاتے ایک دوسرے سے جھگڑنے، لگ جاتے ہیں۔ پہلے یہ سب دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں میری آنکھیں بھر آیا کرتی تھیں۔ لیکن اب ان آوازوں کو سن کر میرے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تیر جاتی ہے۔

سوچتا ہوں اگر برجو نے کبھی ان بچوں کو ....

برجو کے گھر کے تھوڑے سے فاصلے پر رالو کا کا رہتے ہیں۔ ان کی اٹھارہ سال کی لڑکی رادھا کی شادی ابھی تین مہینے پہلے ہوئی تھی۔ رادھا کا شوہر کسی دوسرے شہر میں نوکری کرتا ہے۔

میں جب بھی کبھی اُدھر سے ہو کر گذرتا ہوں .... رادھا مجھے آنگن میں گیہوں بینتی دکھائی دیتی ہے۔ نہ جانے کیوں اس کی سونی آنکھیں ہر آنے جانے والے کو گھورا کرتی ہیں

کل ہی تو نل پر دو چار عورتیں آپس میں باتیں کرتی ہوئی اس کے بارے میں کہہ رہی تھیں

تم نے سنا پچھو کی ماں .... رادھا روز آدھی رات کو اٹھ کر نہاتی ہے۔

کرے بھی تو کیا' بیچاری کا خصم پردیس میں ہے .... پھر یہ پہاڑ سی جوانی ....

ارے چپ وہ آرہی ہے۔

کچھ سنا تم نے .... گودھر کی عورت منگلا کو بھوتنی لگ گئی ہے۔ مہاراج آج صبح سے اس پر ڈنڈے برسا رہے ہیں۔ لیکن بھوتنی مٹنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔

'ارے بھولو دادا' سب بکواس ہے۔ کریم ٹیلو نشے کے عالم میں برجو کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہتا ہے۔

'میں اس کی جورو کو اچھی طرح جانتا ہوں ... سالی بنتی ہے۔'

یہ عورت ذات سالی ہے بری ـــــ برجو اس کی بات تسلیم کرتے ہوئے کہتا ہے۔

روز رات کو بھولا دادا کے چبوترے پر ان تینوں کی بیٹھک جم جاتی ہے۔ ٹھرے کی تیز بو دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ پوری بستی کے چرچے کرنے کے بعد تینوں لڑکھڑاتے ہوئے اپنے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔

پھر آدھی رات تک وہی چیخنے چلانے کی آوازیں ......

صبح اٹھتے ہی جیتو کاکا کی موت کی خبر ملی۔ سن کر بے حد اداسی چھا گئی۔ ذہن میں ایک الجھاؤ سا پھیل گیا۔ گیارہ بجے تک ارتھی کے لئے چندہ ہوتا رہا۔ کریم ٹیلو اور برجو صبح سے ہی بستی والوں سے چندہ جمع کرنے نکل گئے تھے۔

سوچا جیتو کاکا کی ارتھی میں شامل ہو جاؤں۔ لیکن نہ جانے کیوں چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر سکا۔

جیتو کاکا کے چلے جانے کے بعد بستی والوں کے لئے پرانے زمانے کی وہ کہانیاں ختم ہو گئیں۔ جن کو سنتے سنتے ان کے آنکھوں کی چمک بڑھ جایا کرتی تھیں۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں چھوڑ آتے تھے جہاں جیون بہت مہنگا اور روٹی بہت سستی ہوتی تھی۔

کچھ ہی دنوں بعد مسجد کے پچھواڑے ایک کونے میں جہاں جیتو کاکا دن بھر بیٹھے رہتے تھے۔ اب وہاں پر تاش کھیلنے والوں کی بیٹھک جمنے لگی ہے۔ رشتے ٹوٹتے بھی ہیں اور جڑ بھی جاتے ہیں۔ جیتو کاکا اب بھی کبھی کبھی نل پر پانی بھرتی ہوئی عورتوں کی باتوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔

بھولو دادا کے چبوترے سے اٹھتی ہوئی ٹھرے کی تیز بو کے ساتھ جیتو کاکا کے نام کی آواز بھی سنائی پڑ جاتی ہے۔ لیکن جیتو کاکا سے راجہ رانی کی کہانیاں سننے والے بچے ریچھ کا کھیل دیکھنے میں کھو جاتے ہیں۔

ڈگ۔ ڈگ۔ ڈگ کی آواز سنتے ہی جوان، بوڑھے اور بچے سبھی کی ایک اچھی خاصی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

نہ جانے کیوں ریچھ کا برسوں پرانا کھیل دیکھنے میں کھوئے ہوئے بچے بہت پیارے

لگنے لگتے ہیں۔ ان کے مسکراتے ہوئے ہونٹ' اور آنکھوں میں بھرا ہوا تعجب' ان گنت ادھوری اور سسکتی ہوئی کہانیوں کا جنم داتا بن جاتا ہے۔ کھیل ختم ہونے پو بھیڑ چھٹ جاتی ہے۔ کچھ بچے ریچھ کے پیچھے پیچھے چل دیتے ہیں۔ اس کے بعد خاموش ہوتا ہوا آوازوں کا جنگل پھر تیزی سے بستی میں پھیلنے لگتا ہے۔

شام ہوتے ہوئے ان آوازوں کے جنگل سے پھر ایک آواز ابھرنے لگتی ہے۔

رادھا بھاگ گئی۔؟

رادھا کی ماں کی چیخیں کھڑکی سے ہوتی ہوئی مجھے سنائی پڑنے لگتی ہیں۔

ہائے نوروئی...... میری بھولی بھالی بیٹا کو بھگا لے گیا۔

بھگوان کرے شریر میں کیڑے پڑیں...... ہائے ...... اب میں رانڈ کے خصم کو کیا جواب دوں گی۔ نل پر پانی بھرتی ہوئی مجھو کی ماں زمین کی طرف کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی کہتی ہے۔

یہ مہاراج تو بڑا دھورت نکلا۔ کتنی عورتوں کو خراب کر چکا ہے۔ لیکن بچی کو بھی نہیں چھوڑا...... بیچاری رادھا اس کے چکر میں کیسے آگئی۔

ارے میں جانوں اس آوارہ چھنال کو ...... ہر مسٹنڈے کو گھورا کرتی تھی۔ مہاراج تو سیدھا آدمی تھا...... رادھا نے خود بے چارے کو پھانسا ہوگا۔

اور یہ کہہ کر زینت جلدی سے گھڑا لے کر چلی جاتی ہے۔

رادھا کے بھاگ جانے کے بعد راموکاکا گھر سے بہت کم نکلتے ہیں۔ میں نے انھیں رادھا کے جانے کے چار پانچ روز بعد دیکھا تھا۔ تو مجھے ایسا لگا کہ پچاس کے راموکاکا ستر اسی کے ہو گئے ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر بس یہی شبد رہتے تھے۔ جنم جلی' اس بڑھاپے میں کلنک لگا گئی۔ یہ سب دیکھنے سے پہلے اچھا ہوتا میں مر جاتا۔

رادھا اور مہاراج کو لے کو بستی میں طرح طرح کی باتیں گڑھی جانے لگیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا یہ واقعہ بھی بستی والوں کے دماغ میں دھندلا پڑتا چلا گیا۔

اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی روز رات کو سوتے وقت یہی سوچتا ہوں کہ "ٹین کے

چھت پر سلگتا ہوا سورج کبھی تو آشا کی ایک کرن اس بستی میں پھیلے ہوئے آوازوں کے جنگل پر ڈالے گا۔ اور اس پھیلے ہوئے گھور اندھیرے کو مٹا دے گا۔"

"پھر بدھو کے گھر سے روز دھواں اٹھا کرے گا۔"

"کریم شیلو کھانا کھا کر گھر سے جائے گا۔"

"رادھا کی ان کی بوڑھی اور سوتی آنکھوں میں پھر سے چمک آ جائے گی۔"

"کھانا کھاتے ہوئے بچے نہیں جھگڑیں گے۔"

اور بستی والے جیتو کاکا کی کہانیوں میں چھپی ہوئی اس دنیا کو پالیں گے جہاں جیون بہت مہنگا اور روٹی بہت سستی ہوتی ہے۔

نشہ

معقول احمد ندیم

"ویرو" بھولا رام کا اکلوتا بیٹا تھا۔

لیکن اپنے باپ سے اسے وہ پیار نہ ملا تھا جو ایک اکلوتے بیٹے کو ملنا چاہیئے تھا۔

اس نے ہوش سنبھالا تو بھولا کو شراب کا عادی اور ماں کو آنکھوں سے معذور پایا۔ کہنے کو اس کے سر پر ماں باپ کا سایہ تھا۔ مگر یہ اس کی ایک عظیم بدبختی تھی۔ ماں کی آنکھیں نہیں تھیں اور باپ پکا شرابی تھا۔

گھر کے معاشی حالات بہت خراب تھے۔ بھولا کی کوئی مستقل آمدنی نہیں تھی، اس پر بھی یہ ہوتا جتنا وہ روز کماتا آدھے سے زیادہ پیسوں کا نشہ کر ڈالتا ...... اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی دن چولہا نہیں جلتا گھر میں فاقے ہوتے اسے بھوکے پیٹ سونا پڑتا۔ اس طرح مہینے اور برس بیت گئے۔ "ویرو" کی عمر بڑھتی گئی۔ قد بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ گیارہ سال کا ہو گیا۔ کبھی وہ بھوک سے ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر رونے لگتا اور کبھی باپ کو نشے میں دھت دیکھ کر مایوس ہو جاتا۔ دو دن بیت گئے تھے۔ اس کا باپ مزدوری کرنے نہیں گیا تھا تنگ آکر اس نے ماں سے پوچھ ہی لیا۔

"ماں! آج بھی روٹی نہیں دو گی کیا؟"

ماں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی بند آنکھوں میں چند آنسو تھے جو ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے۔ وہ جواب دیتی بھی کیا؟

" بھولا رام " ایک طرف گھٹنوں میں سر دئے بیٹھا تھا۔ " ویرو " کے بار بار روٹی مانگنے پر وہ بے قابو ہوگیا۔ نشے کا بھوت اس پر سوار تھا۔ درجنوں گالیوں کے ساتھ ساتھ ویرو پر درجنوں لکڑیاں بھی ٹوٹ پڑی تھیں۔ شام کا سورج ڈوبنے والا تھا۔ پٹائی سے چور اور بھوک سے نڈھال " ویرو " سوچ رہا تھا پیٹ بھرنے کے لئے چوری کرنے یا مزدوری ....

سوچ اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کا تصوّر کبھی اسے ڈاکٹر امراؤ سنگھ بننے کے لئے مجبور کرتا اور کبھی اسے ماں سے کیا وعدہ یاد آتا۔

" ویرو " نے ماں سے وعدہ کیا تھا وہ خوب پڑھے گا۔ ڈاکٹر بنے گا اور اپنی ماں کی آنکھوں کا علاج کرے گا۔ مگر آج ویرو کے خواب بکھر رہے تھے۔ بھوک ' غریبی اور بھولا رام کی بگڑی عادتیں اس کے خوابوں کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ یہ غنچہ کھلنے سے پہلے ہی مرجھانے کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔

ویرو نے تو آنسو پی لئے تھے۔ مگر دو دن سے بھوکی ماں کا پیٹ بھرنے کے لئے اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ اسے اندھی ماں پر ترس آتا تھا۔

وہ گھر سے نکلا مگر چپکے سے۔ ماں کے کان میں کہہ گیا۔

" مزدوری کرنے جا رہا ہوں۔ ضرور کھانا لے کر لوٹوں گا۔ دروازہ بند مت کرنا۔ "

ماں نے اسے روکنا چاہا مگر لاکھ کوششوں اور منتوں کے باوجود وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ بیچاری ماں کے آنسو ہچکیوں میں بدلنے لگے۔ اس کو بھولا کا ہر ستم گوارا تھا۔ بھوک سے تڑپنا منظور تھا مگر اس عمر میں وہ در در بھٹکے محنت کرے یہ منظور نہیں تھا۔ وہ مجبور و لاچار تھی۔ آج بھولا نے معصوم ویرو کو بھی نہیں بخشا تھا۔

وہ اِدھر اُدھر ہاتھ مارتی رہی۔ ویرو اس کی پہنچ سے کافی دور جا چکا تھا۔ مزدوری کی تلاش اسے ایسی دکان پر لے جا چکی تھی جہاں اس کے ہم عمر کئی لڑکے جمع تھے.....

دکان ڈیکوریشن کی تھی۔ جہاں ہر روز گیس کے ہنڈے باراتوں کے ساتھ لے جانے کے لئے بچے اور بڑے جمع ہو جاتے تھے۔ رات کی مزدوری انھیں اچھی خاصی مل جاتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا کھانے پینے کا جگاڑ بھی ہو جاتا۔ یہ ایک حسنِ اتفاق تھا کہ ویرو کو

اسے دکان پر جاتے ہی کام مل گیا تھا۔

اسے کام تو مل گیا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اس کے نازک کاندھوں پر جگمگاتا ہنڈا کافی وزنی تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ بار بار کاندھوں سے اتار کر اس میں گیس کیسے بھرے گا؟

اگر ہنڈا اگر گیا تو کیا ہوگا؟

میں جل گیا تو کیا ہوگا؟

اس کے چھوٹے سے دماغ میں سوال پے در پے جنم لے رہے تھے۔ وہ سوالوں کی دنیا میں کچھ کھو سا گیا تھا۔ مگر گانے کی دھن اور بینڈ باجوں کی آوازوں نے اسے چونکا دیا۔ دیرو سمجھ گیا بارات روانہ ہونے والی ہے۔ سبھی نے اپنے اپنے ہنڈے کاندھوں پر رکھنا شروع کر دئے۔ جیسے تیسے اس نے بھی اپنا ہنڈا کاندھے پر رکھ لیا اور جلد سے جلد دلہن کے گھر پہنچ جانے کے لئے مستعد ہو گیا۔ وہ پہلی بار کسی برات کے ساتھ گیس کے ہنڈے لے کر چل رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ باراتوں کا ایک محلہ سے دوسرے محلہ تک پہنچنا کمسن بچوں کے لئے جوئے شیر لانا ہے۔

بارات آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ قدم قدم پر ڈسکو ڈانس اور بھنگڑا ناچ کا دور چل رہا تھا۔ ایسے میں بارات جگہ جگہ ٹھہر جاتی۔ ہنڈا اٹھائے بچے بھی کھڑے ہو جاتے۔ ایک جگہ بارات کا جلوس کافی دیر تک ٹھہرا رہا۔ نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ ویڈیو کیمرہ اس خوشنما منظر کو قید کر رہا تھا۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ اپنے آپ کو کیمرے کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ بڑی گہما گہمی اور شور و غل تھا.. ...... مگر دیرو......

دیرو کی تو کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ جب جب کیمرے کی لائٹ دیرو کے چہرے پر پڑتی اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ وہ سوچنے لگتا کیا کرشمہ ہے؟ خدا نے کسی کو ڈھیروں اجالا بخش رکھا ہے۔ اور کسی کی دنیا ہی اندھیری ہے۔ یہ سوچ کر اس کے ذہن میں اندھی ماں کا چہرہ ابھر آتا۔ اس کا جی چاہتا کہ سارا اجالا اپنی جھولی میں سمیٹ لے اور ماں کی آنکھوں میں جا کر بھر دے۔ ماں کی یاد آتے ہی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ گھبراہٹ اس پر حاوی ہو جاتی۔
ایک جگہ وہ پاس میں کھڑے (Gentle man) جینٹل مین سے سوال کرنے لگا۔

"کتنا ٹائم ہوا ساب ؟"

"دولہن کا گھر کتنا دور ہے ؟"

کبھی اسے جواب مل جاتا اور کبھی جھڑکی۔ واپسی میں رات کی سیاہی، کتوں کا ڈر، سنتریوں کا خوف اس کی پریشانی میں اضافہ کر رہا تھا۔

بارات کو چلتے ہوئے دو گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اب تو دیود کے کاندھوں نے بھی جواب دے دیا تھا۔ چلتے چلتے برات ایک چوراہے پر آ کو رک گئی جہاں ہزاروں قمقموں سے سجا سجایا دلہن کا مکان نظر آ رہا تھا۔

دیود کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ دلہن کے گھر پہنچ کر اس نے راحت کی سانس لی۔ رات کافی ہو گئی تھی۔ اجرت ملتے ہی وہ ہوٹل کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ جیسے جیسے اس کی آنکھوں میں اپنی بھوکی ماں کا چہرہ ابھرتا وہ اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دیتا۔ دوڑتے دوڑتے دیود کہاں کا کہاں نکل گیا۔ رات کا سناٹا بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ کسی ہوٹل کا دروازہ کھلا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سب دکانیں اور ڈھابے بند ہو گئے تھے۔

البتہ اسے چند سنتری ضرور دکھائی دے۔ دیود کو کچھ تسلّی ہوئی۔ مگر اسی وقت سپاہیوں کے ذریعہ پٹائی اور پیسے چھین لئے جانے کے ڈر سے وہ سہم گیا۔ اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آدھی درجن پولس کے جوانوں نے اسے گھیر لیا جو نشے میں مست تھے۔ وہ دیود پر اس طرح غرّانے لگے جیسے سرحد سے دشمن کو للکار رہے ہوں۔

"کون ہے تو ؟ کہاں سے آ رہا ہے ؟"

"کرتا کیا ہے ؟"

"یہ پیچھے ہاتھ کیوں چھپا رکھا ہے ؟"

"اتنی رات گئے کدھر گیا تھا۔ چل تھانے چل"

"میں چور نہیں ہوں۔ دیود ہوں۔ دیود۔ قاضی پاڑہ رہتا ہوں۔ ماں دو دن سے بھوکی ہے ہنڈا لے کو بارات کے ساتھ گیا تھا۔ میرے کپڑوں میں پیچھے کی طرف ایک جیب ہے۔ اسی میں مزدوری سے ملے پیسے ہیں پورے دس روپیے ہیں ساب۔"

اور پولس کے لمبے لمبے ہاتھ پیچھے والی جیب تک جا پہنچے تھے۔

"کیوں رے پولس کو دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ یہ دس نہیں بارہ روپیہ ہیں۔ جھوٹ بولتا ہے۔"

ڈیوڈ کو برا لگا۔ اور وہ روتے ہوئے آنسو بہا کر اپنے بے قصور ہونے کی فریاد کرنے لگا وہ رات کے ان محافظوں کو کیا جواب دیتا جو نشے میں اتنے مدہوش تھے کہ دس روپیوں کو بھی بارہ روپیہ گن رہے تھے۔ خاموشی اس کا قصور اور سزا بنتی جارہی تھی۔ وہ رات کی تنہائی میں کس سے انصاف کی گوہار کرتا۔

ابھی یہ معاملہ جاری ہی تھا کہ رات کو گشت لگاتی جیپ کے ہارن نے انھیں تتر بتر کر دیا۔ وہ اس جھمیلے سے نکل تو گیا۔ مگر وہ کہاں جائے۔ رات آدھے سے زیادہ اپنا سفر طے کر چکی تھی۔ آسمان پر ان گنت نظر آنے والے تارے اب انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ مرغوں کی بانگ اور چڑیوں کی چہچہاہٹ نے پوپھٹ جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ سفیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ اب تو ڈیوڈ کو راہ گیر بھی نظر آرہے تھے اور ادھ کھلے ہوٹل اور ڈھابے بھی۔ بھوکی ماں کا پیٹ بھرنے کی خوشی نے اس کے حوصلے پھر سے بڑھا دئے تھے۔ اور سچ بھی ہے حوصلے جب بلند ہو جاتے ہیں تو منزلیں خود قدم چومنے لگتی ہیں۔

آخر کار وہ ایک کھانے کی ہوٹل تک پہنچ ہی گیا۔ اس نے دیکھا ہوٹل مالک حقہ گڑگڑا رہا ہے۔ وہ بولا۔ "تین آدمیوں کا کھانا پیک کر دو جی۔"

"ابے جا یہاں سے صبح ہی صبح آگیا۔"

"بھائی صاحب دے دونا۔ ماں دو دن سے بھوکی ہے۔"

"رات کا بچا ہوا ہے وہ چلے گا۔"

"کیسا بھی ہو سب چلے گا۔" ڈیوڈ کے یہ کہنے پر ہوٹل مالک لڑکھڑاتا اٹھا اور اندر کی طرف جا کر رات کا بچا کھچا کھانا پیک کر دیا۔

ڈیوڈ کھانا لے کر گھر کے لئے دوڑ پڑا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ اور سوچتا جارہا تھا۔ اپنی محنت کی کمائی سے ماں کا پیٹ بھرے گا۔ اب وہ خوب کمائے گا خوب کھلائے گا اور

ماں کی آنکھوں کا علاج کرائے گا۔

جیسے ہی وہ گھر کے قریب پہنچا اس نے دیکھا شکستہ مکان کے چبوترے پر محلے کے لوگ جمع ہیں۔ وہ حیرت زدہ ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ ...... گھر کے اندر کہرام مچا تھا۔

داخل ہوتے ہی اسے معلوم ہوا کہ بھولا نے رات کو نشے کی حالت میں اپنی جورو کا گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

جی ہاں.... گھر کے اندر اس کی اندھی بھوکی "ماں" کی بے جان پڑی لاش اس کا انتظار کررہی تھی.....!

اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش وہ بھی "نشے" میں ہوتا۔ اور اپنے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

خوشبو کا گیت

ممتاز شکیب

"کیا تم نے کبھی — کالے گلاب کا پھول دیکھا ہے دیال — ؟" عرشی نے اپنے بچپن کے دوست سے یہ سوال اس وقت کیا تھا جب وہ دونوں کالج میں پڑھ رہے تھے اور دیال گلاب کے پھولوں کا بہت شوقین تھا۔ "سن رہے ہو — میں کیا پوچھ رہا ہوں —" عرشی نے دیال کو خیالوں میں گم دیکھ کر جھنجھوڑا تو وہ چونک کر بولا۔

"کیا ———— ؟" دیال اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا.....

"میں پوچھ رہا ہوں ———— کیا تم نے کبھی کالے گلاب کا پھول دیکھا ہے۔"

"نہیں — میں نے تو اس پھول کے بارے میں صرف کہانی قصوں میں پڑھا ہے۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ — میں تمہیں آج کالے گلاب کا پھول دکھاؤں گا۔" یہ کہہ کر عرشی دیال کو رام باغ پیلیس کی اس خاص نوسری میں لے گیا جہاں اس کے والد بزرگوار کے دوست مسٹر خان لندن سے گلاب کی گرافٹنگ کا اسپیشل کورس کرنے کے بعد رانی گایتری دیوی کے لئے گلاب کے پھولوں کی نایاب قسمیں تیار کر رہے تھے۔

"یہ دیکھو —" نوسری پہنچ کر عرشی نے دیال کی طرف نہایت خوبصورت سرخی مائل کالا گلاب بڑھایا تو وہ اسے بھونچکا سا دیکھتا رہ گیا۔

"کیوں — کیا تم نے کبھی اتنا بڑا حسین گلاب کا پھول دیکھا ہے — ؟" عرشی فخریہ انداز میں بولا تھا۔

"نہیں !" — اور یہ کہہ کر دیال نے بے ساختہ پھول کو ہاتھ میں لے کر حیرت سے دیکھتے ہوئے لگایا تو اچانک اس کے جذباتی رویّے میں ایک تبدیلی سی آئی اور پھر اس نے گلاب کے پھول کو عرشی کی طرف پھینکتے ہوئے حقارت سے کہا۔

"بکواس — ایک دم فراڈ —"

"کیا مطلب — ؟" عرشی نے پھول کو ہاتھ میں لے کر بڑی حیرت سے دیال کی طرف دیکھا تھا۔

"پھول کتنا ہی خوبصورت اور نایاب سہی اگر اس میں خوشبو نہیں تو وہ محض فراڈ ہے۔"

اور یہ کہتے ہی دیال فوراً نرسری سے باہر آگیا ......

دیال جے پور کے مشہور سنگ تراش گھرانے کا ہونہار فرد تھا۔ اس میں بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں تھیں۔ وہ فطرتاً حسن پرست تھا اور کسی بھی خوبصورت شے کو دیکھ کر کھو جایا کرتا تھا۔ اس لئے وہ بچپن سے ہی چھوٹی چھوٹی سنگ مرمر کی خوبصورت مورتیاں تراش کر اپنے خانوادے کے فنکاروں کو چونکاتے ہوئے مستقبل کے عظیم فنکار ہونے کی بشارت دے چکا تھا۔ کالج کے دنوں میں دیال نے عرشی کو بارہا اپنی بنائی ہوئی اتنی حسین مورتیاں دکھائی تھیں کہ وہ بھی اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ اس لئے عرشی نے دیال سے اس زندہ و جاوید مورتی' دکھانے کی بھی کئی بار فرمائش کی تھی جس کو وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا تھا لیکن یہ عجیب بات تھی کہ دیال نے اسے کبھی وہ لڑکی نہیں دکھائی جس سے وہ عالم شباب میں ٹوٹ کر پیار کرنے لگا تھا۔

اور پھر — گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دن یہ ہوا کہ دیال اپنی محبوبہ کے ساتھ رام گڑھ جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا عرشی کو ٹکرا گیا۔ دونوں دوستوں نے پہلے تو ایک دوسرے کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر — دیال نے قدرے مسکراتے ہوئے اس معصوم سی حسین کو دور سے عرشی کو دکھایا تو وہ اسے بھونچکا سا دیکھتا رہ گیا ......

"تو یہ ہے وہ — تمہاری محبوبہ جس کو تم گلاب کے پھول سے تشبیہہ دیتے ہو —" عرشی کو ہوش آتے ہی شرارت سوجھی تھی۔

"ہاں —" دیال نے مسکراتے ہوئے عرشی کی طرف دیکھا تھا۔ "کیوں ہے نا اسی گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت جو تم نے مجھے اس دن نوسری میں دکھایا تھا — ...؟"

"وہ تو ہے مگر — اس کی خوشبو —؟" عرشی نے چٹکی لی تھی۔

"خوشبو' تو ایک گیت ہے عرشی — جو دیکھا یا سنا نہیں محسوس کیا جاتا ہے —"

"میں اس وقت پھول کی نہیں تمہاری اس محبوبہ کی بات کر رہا ہوں —"

"میری کلپنا بھی دوشیزگی اور پاکیزگی کا مہکتا ہوا پھول ہی ہے جس نے میرے دل میری روح کو معطر کیا ہے اس لئے میں پیار سے کلپنا کو 'خوشبو' کہتا ہوں — ان سے ملو کلپنا یہ ہے میرا وہ جگری دوست —"

"نمستے —" کلپنا جو بہت دیر سے ان کی سرگوشیوں سے ہلکان تھی بڑے احترام اور شردھا سے عرشی کو دیکھ رہی تھی —

"کیوں کلپنا جی — یہ آپ نے میرے دوست پر کیا جادو کر دیا جو اسے آپ کے علاوہ — اب کوئی پھول اچھا نہیں لگتا —؟" عرشی نے کلپنا کو چھیڑتے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ ایک دم شفق گوں ہو گیا اور وہ قدرے لجاتے ہوئے اپنے آپ میں اس طرح سمٹتی چلی گئی جیسے عرشی کے کلپنا کو نظروں سے نہیں ہاتھوں سے چھو لیا

دیال فطرتاً جتنا محتاط کم گو اور سنجیدہ واقع ہوا تھا اتنی ہی مختصر فلسفیانہ گفتگو کرنے کا عادی تھا اس لئے دیال نے اپنے مزاج کے مطابق ایسی ہی لڑکی کا انتخاب کیا تھا جو اس کی ہم خیال اور ہم مزاج ہونے کے علاوہ خوبصورت ہی نہیں بلکہ ایک ابھرتی ہوئی ایسی چتر کار بھی تھی جس کے پتا کشن گڑھ پینٹنگ اسکول کے ایک نمائندہ مصور تھے۔

عرشی اور دیال جب ایک دوسرے سے بچھڑے تو کلپنا کی دیال سے منگنی ہو چکی تھی۔ عرشی فلم اور تھیٹر سے متعلق ڈپلومہ کرنے جرمنی چلا گیا اور دیال کالج چھوڑنے کے بعد مجسمہ سازی میں منہمک ہو گیا تھا۔

تقریباً تین سال بعد عرشی بمبئی آ کر گلنار فلم اسٹوڈیو کے مالک بدار صاحب کا اسسٹنٹ ہو گیا جو اس کے والد کے عزیز دوست مشہور ڈاکیومینٹری فلم ساز تھے۔ عرشی کو بمبئی اس

لئے عجوب تھا کہ دیال بھی عروس البلاد میں آبسا تھا۔ عرشی کو یہ اطلاع جومنی کے قیام کے دوران اس وقت ملی تھی جب دیال اپنی منگیتر کلپنا کی اچانک موت کے حادثے کے بعد اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اس اذیتناک واقعہ کی وجہ سے وہ اپنے اور کلپنا کے آبائی وطن کو چھوڑنے کے لئے پر تول ہی رہا تھا۔ کہ اچانک دیال کو بمبئی سے اس کے بیمار انکل کا بلاوا آگیا اور وہ بمبئی آکر ان کی جائداد اور اسٹوڈیو کی دیکھ بھال میں خود کو مصروف رکھنے کی سعی کرنے لگا۔

بمبئی پہنچنے کے دوسرے دن عرشی صبح کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر اچانک ایک اشتہار پر پڑی تو وہ ایک دم چونک گیا ــــــ .....

"مشہور سنگ تراش ہر دیال جیمنی کو اپنے ایک آئڈیل مجسمہ کے لئے خوبصورت ماڈل گرل کی ضرورت ہے۔ خواہش مند حسین لڑکیاں ذیل کے پتے پر آکر ملیں۔ معاوضہ حسبِ منشا دیا جائے گا ـــــ"

اس تحریر کو پڑھتے ہی عرشی کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اسے بے ساختہ اپنا مظلوم دوست یاد آگیا ـــــ وہ چاہتا تھا کہ دیال کو اچانک جاکر سرپرائز دے اس لئے عرشی نے اسے ٹیلیفون نہیں کیا اور تین چار دن تک اپنا کام سمجھنے کے لئے اسٹوڈیو میں مصروف رہا..... اس دوران اسٹوڈیو میں آنے والی کئی لڑکیوں نے یہ بھی انکشاف کیا تھا کہ ہر دیال نام کا سنگ تراش بڑا سنکی ہے جو پچھلے کئی ماہ سے شہر کی ایک سے ایک حسین لڑکی کو ریجکٹ کر کے ان کی توہین کر رہا ہے اور کسی کو اب تک اپنے اس مجسمہ کا ماڈل نہیں بنا سکا جس کو وہ اپنا آخری مجسمہ کہہ کر تراشنا چاہتا ہے۔

بالآخر ــــ ایک شام عرشی اپنے بچپن کے دوست ہر دیال سے ملنے اس کے اسٹوڈیو پہنچا تو اسے دیکھ کر خوشی بھی ہوئی ساتھ ہی رنج بھی ہوا کہ وہ پہلا جیسا تندرست وتوانا دیال نہیں بلکہ دھان پان سا ایک ایسا دماغی مریض سا ہو کر رہ گیا ہے جیسے کوئی غم اندر ہی اندر کھائے چلا جا رہا ہے ــــ .....

"یہ تمہاری صحت کو کیا ہو گیا ؟ ــــ" اس نے بڑی گرم جوشی سے دیال کو سینے سے لگاتے ہوئے سوال کیا تو اس کے ہونٹوں پر وہی خفیف سی مخصوص مسکراہٹ رینگ گئی ــــ

"اچھا بھلا توہوں ـــــ تم سناؤ کیسے ہو کب آئے اور کیا کر رہے ہو ـــ" عرشی نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا کر دانستہ کلپنا کا تذکرہ نہ کرتے ہوئے دیال سے مسلسل کئی سوال کئے مگر وہ اپنے اسی مخصوص انداز میں نپی تلی مسکراہٹ کے ساتھ ہاں اور نہ میں سے جواب دیتا رہا جو عرشی کے لئے اور زیادہ تشویشناک ہوتے چلے گئے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ دیال شروع سے ہی کم گو ہے اور بڑی سے بڑی بات کو مختصر الفاظ میں ادا کرنا اس کی پرانی عادت ہے اس لئے عرشی نے زیادہ بازپرس نہ کرتے ہوئے موضوع بدلا ـــ

"میں نے سنا ہے ـــــ تم نے پچھلے تین سال سے کوئی مجسمہ نہیں بنایا۔"

"ہاں ـــــ اب میری صحت ٹھیک نہیں دل بہت کمزور ہوگیا ہے۔"

"شراب کیوں نہیں چھوڑ دیتے ـــــ" عرشی نے اس کے منی بار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔

"جینے کے لئے کسی نہ کسی شئے کا سہارا بہت ضروری ہے عرشی، چلو تمہیں ایک عمدہ کاک ٹیل پلاتا ہوں ـــ" یہ کہتے ہی دیال نے اپنے ملازم کو پکارا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے اسٹوڈیو کے ایک سیل کی طرف بڑھ گیا ـــ ..... اور پھر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر بیتے ہوئے بچپن کے ایام سے لے کر اپنے اچانک بچھڑنے اور پھر دیارِ غیر میں آکر ملنے تک کی لامتناہی باتوں کے سلسلوں میں کھو گئے ـــ .....

"میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم ان خوبصورت لڑکیوں کو بری بری طرح پھٹکارتے ہو جو تمہارے مجسمہ کا ماڈل بننے کے لئے تمہارے پاس کھنچی چلی آتی ہیں۔ ؟"

"ہاں ـــ یہ صحیح ہے ـــ" دیال نے سگریٹ کا کش لے کر دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے جواب دیا تو میں نے اسے گھورتے ہوئے دیکھا ـــ ....

"کیوں ؟"

کیوں کہ اس شہر کی جن لڑکیوں میں وہ رمق وہ جیوتی نہیں جو میں اپنے اس آخری مجسمہ میں سمونا چاہتا ہوں"

"یہ تم ـــــ اپنے اس مجسمہ کو آخری کہہ کر زندگی سے مایوسی کا اظہار کیوں کرتے ہو"

اس لئے کہ اب میری صحت اس خزاں رسیدہ زرد پتے کی طرح ہے جو کسی بھی وقت زندگی کی شاخ سے ٹوٹ کر گر سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ " یہ کہتے کہتے دیال کی آنکھوں کی چمک اچانک ماند پڑ گئی اور وہ بجھی بجھی آنکھوں سے خلاؤں میں اس طرح گھور کر دیکھنے لگا جیسے اپنی کسی انمول گمشدہ شے کو تلاش کر رہا ہے ۔۔۔

اس کے بعد ــــ عرشی اور دیال اکثر ملتے رہے ۔ دونوں پہروں باتیں کرتے لیکن عرشی دانستہ دیال کی تشویشناک صحت یا اس کے مجسمہ نہ بنانے سے متعلق کوئی بات نہ کرتا ۔ یہاں تک کہ ایک دن عرشی کے سامنے دیال نے سلورنا اور نیشہ جیسی حسین ماڈل گرل کو بھی لتاڑتے ہوئے اپنے اسٹوڈیو سے واپس بھیج دیا جب کہ انھوں نے محض عرشی کی گذارش پر بلا معاوضہ اس کے آئڈیل مجسمہ کا ماڈل بننے کے لئے ذاتی طور سے بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا ۔ نیشہ اور سلورنا کے جاتے ہی عرشی بری طرح کھولتے ہوئے دیال پر برسنے لگا ۔

" آخر تم ان خوبصورت لڑکیوں کی اس طرح بے عزتی کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو ۔ ؟ "

" اس لئے کہ ان میں سے کسی کے چہرے پر حسن کی وہ پاکیزہ رمق نہیں جو معصوم سی لجاتی ہوئی دوشیزاؤں کی آنکھوں میں ستاروں کی طرح دمکتی ہے ــــ "

دیال نے سنجیدگی سے جواب دیا تو عرشی پھر بھڑک اٹھا ۔

" آخر ــــ ایسی لڑکی تمہیں کہاں ملے گی ــــ ؟ "

" دکھ تو اسی بات کا ہے دوست ۔ حسن کے اس انمول خزانے کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آتے ہیں ــ جس کی ایک معمولی سی جھلک بھی شہر کی ان ماڈل لڑکیوں میں نہیں جو میرے مجسمہ کو اپنے اس اچھوتے روپ کی لو سے روشن کر سکیں ــ ۔۔۔ "

" تمہاری یہ بے تکی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں ــــ " عرشی نے زچ ہو کر بات کو ختم کرنا چاہا مگر دیال متواتر بولتا رہا ــ

" تم نے نیویارک کا عظیم مجسمہ 'اسٹیچو آف لبرٹی' دیکھا ہے ــ ؟ "

" نہیں ــــ " عرشی اکتا کر سگریٹ سلگانے لگا ۔

" 'سنہری شاپو' کا جان آف آرک ــــ ؟ "

"نہیں ـــــ وہ بھی نہیں دیکھا ـ"

"اَرگسٹ کا مشہور مجسمہ "تھاٹ" ـــــ ؟"

"میں نے ان میں سے کوئی مجسمہ نہیں دیکھا ـ" عرشی بری طرح جھنجھلایا تھا۔

"تاج محل جیسی حسین اور بے مثال عمارت تو دیکھی ہے ـــ ؟"

"ہاں ـــــ اس سے تمہارا مطلب ـــ ؟" اس نے اکھڑ کر کہا تھا۔

"فن کے یہ حسین لافانی شہ پارے اسی عورت کے اچھوتے حسن اور اس کی پاکیزہ محبت کے مرہونِ منت ہیں اس لئے میں بھی کسی ایسی ہی آئڈیل لڑکی کے پاکیزہ روپ کی جیوتی کو اپنے اس آخری شاہکار مجسمہ میں ختم کرنا چاہتا ہوں جو اسٹیچو آف لبرٹی' تھاٹ' اور جان آف آرک' جیسے حسین مجسموں کے عنوانات کی مناسبت سے دیکھنے والے کو اپیل کرے ـ"

"ویسے بائی دا وے تمہارے اس مجسمہ کا عنوان کیا ہوگا ـــــ ؟" عرشی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزاً پوچھا تھا ـــ

"یہ عنوان خود اس مجسمہ سے بولتا ہوا ملے گا ـــــ" اور یہ کہہ کر دیال فنِ مجسمہ سازی کی تاریخ دہرانے لگا اور اس کا دوست عرشی سگریٹ کے کش لے کر خلاؤں میں اس طرح دھواں چھوڑتا رہا جیسے وہ بور ہوکر دیال کی نہ ختم ہونے والی باتوں کو بھی دھوئیں میں اڑا رہا ہے ـــــ ....

اس کے بعد عرشی اور دیال گاہ بگاہ ملتے رہے۔ وہ دونوں مختلف موضوع پر باتیں کرتے اور پھر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ۔ اسی طرح پانچ چھ مہینے گذر گئے مگر دیال کو وہ لڑکی نہ ملی جس میں وہ اپنا آئڈیل تلاش کر رہا تھا۔ اس دوران عرشی برار صاحب کے ساتھ مختلف فرم کے لئے پبلیسٹی ایڈ اور کامرشیل فلمیں بھی بنانے لگا۔ ایک دن برار اسٹوڈیو میں ساہنی پروڈکشن کی ایک فیچر فلم کا مہورت شاٹ تھا۔ عرشی نے دیال کو بھی ٹیلیفون کرکے بلالیا۔ برار اسٹوڈیو میں خاصی رونق تھی۔ مہورت شارٹ کے لئے کیمرا مین تیار تھا۔ فلم کی ایک نئی ہیروئن کلاشرما جو حال ہی میں اجنتین سے آئی تھی غصے میں بھری ایک طرف کھڑی تھی اور اچانک اس کی جگہ مشہور ماڈل گرل سلورنا کو ہیروئن کے

طور پر کیمرے کے سامنے لایا گیا تو ہر طرف سرگوشیاں سی ہونے لگیں۔ سیٹ پر متعدد آرٹسٹوں کے علاوہ مخصوص مہمانوں کا بھی اچھا خاصہ جھرمٹ تھا۔ سب کی نظریں فلم کی نئی ہیروئن سلورنا پر مرکوز تھیں لیکن دیال متواتر ایک طرف کھڑی کلا شرما کو غور سے دیکھتے ہوئے سگریٹ کے لگاتار کش لے کر دھویں کے مرغولے بناتا رہا ـــــ اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے انگڑائیاں سی لیتی ہوئی دھویں کی لکیروں کو دیکھ کر دیال کو لگا جیسے اس کے خیالوں میں بسی ہوئی حسین لڑکی کا خیالی سراپا اچانک حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے کسمسا رہا ہے ـــ ....

" وہ لڑکی کون ہے عرشی ؟" دیال نے ایک دم مچلتے ہوئے اپنے قریب کرسی پر دراز عرشی کو جھنجھوڑا تو اس نے دیال کو کھا جانے والی نظروں سے گھور کر دیکھا ـــ ....

" کون لڑکی ـــــ ؟"

" وہی جو اس طرف کونے میں کھڑی تلملا رہی ہے ـ... ؟"

" لڑکی تمہارے مطلب کی نہیں فلم زدہ ہے " عرشی سمجھ گیا تھا کہ وہ کلا کے بارے میں پوچھ رہا ہے مگر دیال اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوا۔

" فلم زدہ ہے تمہارا مطلب ـــ ؟" دیال کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

" یہ لڑکی کل تک اس فلم نقلی ہیرا کی کاغذی ہیروئن تھی اور اسی کا نام کلا شرما ہے۔

" کلا ؟" دیال کے منھ سے بے ساختہ نکلا تھا ـــ

" ہاں ! کلا !" عرشی نے جھنجھلا کر آہستہ سے کہا تو دیال ایک دم کرسی سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

" بیشک ! ـــــ یہی ہے وہ کلا " دیال کلا کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے دیوانوں کی طرح بڑبڑاتا رہا۔ " قدرت کا حسین شاہکار " حسن کا ایک ایسا مجسمہ جس کے حسن کی پاکیزہ جوت سے اس کا چہرہ جگمگا رہا ہے۔ "

" کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے ؟" عرشی نے تلملاتے ہوئے پیچھے سے دیال کا کرتا پکڑ کر اسے روکنا چاہا مگر وہ کلا کی طرف کھنچتا چلا گیا.... مہورت شارٹ کے بعد جب مبارکبادی کا سلسلہ شروع ہوا تو کلا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ دیال مایوس سا ایک

طرف کھڑا تھا۔ سلورنا کو لوگ گھیرے کھڑے تھے اور چاروں طرف یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ مس کلا شرما انتہائی بد دماغ اور بد تمیز لڑکی ہے جس نے خوبصورت شارٹ سے پہلے میک اپ روم میں فلم کے پروڈیوسر سہانی صاحب جیسے شریف آدمی کے منھ پر طمانچہ مارنے کا خمیازہ بھگت لیا۔ جب کہ عرشی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ سہانی صاحب کتنے شریف اور با تمیز ہیں۔

عرشی کئی دن تک یہ سوچ کر جھنجھلاتا رہا کہ آخر دیال نے سلورنا اور نیشا جیسی خوبصورت لڑکیوں کے مقابلے اس معمولی سی حسین لڑکی کو ترجیح کیوں دی جو اسی کی طرح سنکی ہے' اس حقیقت کو جاننے کے لئے عرشی نے کئی بار دیال کو ٹیلیفون بھی کیا مگر اس کے نوکر نے یہی جواب دیا کہ صاحب کلا دیوی کو سامنے بٹھا کر مورتی بنانے میں مگن ہیں اس لئے وہ اب کسی سے بات نہیں کریں گے۔ یہ سن کر عرشی کو طرارا آگیا۔ آخر یہ فنکار کا بچہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے ---- اس نے جھنجھلا کر ٹیلیفون رکھ دیا۔ عرشی ان دنوں خود بھی مصروف تھا اس لئے دیال سے خود جا کر بھی نہیں مل سکا اور اس طرح دیال اپنا وہ آئڈیل مجسمہ تراشنے میں منہمک ہوگیا جس کو وہ پچھلے تین سال سے بنانے کے منصوبے بنا رہا تھا اور اپنے حلقے میں اس کے تذکرے کر کے شہرت کو ہوا دے رہا تھا۔

کئی دن بعد عرشی کو فرصت ملی تو وہ تلملاتا ہوا دیال کے اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ اس کے نوکر نے عرشی کو لاکھ روکنا چاہا مگر وہ نوکر کو لتاڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیال اپنے اسٹوڈیو کے ایک مخصوص کمرے میں کلا کو اپنے سامنے بٹھا کر سنگ مرمر کو چھینی اور ہتھوڑے سے چھیل رہا تھا اور اسٹوڈیو میں چھینی کی آواز گونج رہی تھی۔

"تم شاید کچھ کہنا چاہتی تھیں ـــــ؟" دیال نے اچانک ہاتھ روک کر کلا کی آنکھوں میں دیکھا تو عرشی ایک دم ٹھٹھک کر ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔

"دیال صاحب!" کلا اپنے بالوں کو ایک طرف جھٹکتی ہوئی گنگنائی تھی۔ "آپ بلاشبہ ایک مہان کلاکار ہیں لیکن ـــــ"

"لیکن کیا ـــــ؟" کلا کے چپ ہوتے ہی دیال مضطرب ہو کر بولا تھا۔

"شما کریں ــــ آپ یہ مورتی بناتے ہوئے مجھے دیکھتے زیادہ ہیں اور مورتی کم تراشتے ہیں .....۔" کلا نے اپنی بات پوری کی تو دیال نے ایک دم اس طرح قہقہہ لگایا کہ اس کی ہنسی چاروں طرف گونجنے لگی ــــ...

"میں تو صرف ــــ یہ جاننا چاہتی ہوں ــ' کلا نے قدرے جھینپتے ہوئے دیال کی طرف دیکھا تھا۔

"آخر آپ ــــ مجھے اس طرح دیکھ کر اس پتھر میں کیا سمونا چاہتے ہیں ــــ؟"
کلا نے گھبراتے ہوئے ایک سانس میں بات پوری کی تو دیال ایک دم سنجیدہ ہو کر اس کے میک اپ سے عاری چہرے کو غور سے دیکھنے لگا جو اس کے فطری حسن کی ہلکی ہلکی سرخی سے دہک رہا تھا۔

"میں دراصل ــــ تمہارے روپ کی اس لو کو دیکھتا ہوں جس نے تمہارے چہرے کو روشن کیا ہے۔ بس میں اسی جیوتی سے اپنی مورتی کے چہرے کو دمکانا چاہتا ہوں۔"
یہ کہہ کر دیال اپنے نامکمل مجسمہ کی طرف پلٹا تو وہ عرشی کو دیکھتے ہی چونک پڑا ــــ...

"تم کب آئے ــــ؟"

"بس ابھی آکر کھڑا ہوا ہوں ــــ"

"تو پھر آؤ ــــ تمہیں ایک بار پھر اس خوشبو' سے ملواؤں جس کو صرف محسوس کیا جاتا ہے ــــ"

"میرا نام خوشبو' نہیں جناب! کلا شرما ہے اور شاید پہلے ہم کہیں مل چکے ہیں ــ"
کلا مسکراتی ہوئی عرشی کی طرف بڑھی تھی ــــ....

"جی ہاں ــــ ہم بمبار اسٹوڈیو میں اس وقت ملے تھے جب آپ نے فلم کے مہورت شارٹ سے پہلے مسٹر سہانی کو دن میں تارے دکھائے تھے ــــ" اور یہ سنتے ہی کلا نے زور سے قہقہہ لگایا تو وہ دونوں بھی ہنسنے لگے ــــ...

کلا کو جلدی جانا تھا اس لئے عرشی اس کے جاتے ہی دیال پر بری طرح برسنے لگا اور دیال اپنی مخصوص دیرینہ مسکراہٹ کے ساتھ عرشی کو دیکھتا رہا ــــ...

" آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو ـــــ " عرشی کے کھل کر بول جانے کے بعد دیال نے منہ کھولا تھا۔

" آخر تم نے سلورنا اور نیشا جیسی حسین لڑکیوں کے مقابلے کلا کو ترجیح کیوں دی ـــــ جب کہ سلورنا نے خود مجھ سے تمہارے اس مجسمہ کا ماڈل بننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

" کیا تم نہیں جانتے کہ میں بچپن سے مورتیاں بناتا رہا ہوں اور پچھلے تین سال سے کوئی مجسمہ نہیں بنا سکا ـــــ "

" آخر کیوں نہیں بنا سکے ـــــ ؟ " عرشی جھنجھلا کر بلا سوچے سمجھے بولا تو دیال نے سنجیدگی سے کہا۔

" اس لئے کہ میری کلپنا مر گئی تھی' میری امنگ میرے فنکارانہ حسن کا خون ہو گیا تھا۔ "

" تم کہنا کیا چاہتے ہو ـــــ ؟ "

یہی کہ کلپنا کی موت میرے فنکارانہ جذبے اور فن کی موت تھی' وہی کلپنا جس کی آنکھوں میں عورت کے حسن کی پاکیزہ جوت اس کی حقیقی روح ستاروں کی طرح چمکتی تھی اور وہ مجھے ہمیشہ ایک آئیڈیل مجسمہ بنانے کے لئے اکسایا کرتی تھی جس کا میں ـــ ایک حسین خاکہ بھی بنا چکا تھا لیکن ـــ اس کی موت کے بھیانک حادثہ نے ـ مجھ سے ـ کلپنا کا خیال تک ـ چھین لیا تھا ـ میرے دوست "۔ یہ کہتے کہتے دیال کی آواز بھرّا گئی اور وہ اچانک خاموش ہو کر اپنی ہیجانی کیفیت اور بھڑکتی ہوئی چنگاری کو دبانے کی سعی کرنے لگا تو اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں ـــ اسے شاید کلپنا کی موت کا اذیتناک واقعہ یاد آگیا تھا جب اسے چند غنڈوں نے بیچ بازار سے اغوا کر لیا تھا اور اس نے اپنی عصمت کا تحفظ کرتے کرتے ان وحشیوں کی قید میں اپنی جان دے دی تھی۔

دراصل وہی کرب ـــ دیال کی روح سے اس کی آنکھوں سے چھلک اٹھا تھا۔ عرشی اسے چھیڑ کر اندر ہی اندر پچھتا رہا تھا اور دیال نے چند لمحوں بعد رندھے ہوئے گلے سے پھر بولنا شروع کر دیا تھا ـــــ ...

" کلپنا کی موت کے بعد ـ میں نے لاکھ چاہا اس کے روپ اس کے خیال کو ہمیشہ کے

لئے پتھر میں محفوظ کر دوں لیکن میرا مفلوج من پھر خیالوں میں بھی اس کی تصویر نہ بنا سکا اور جب میں نے ـــــ اپنے خیالوں کے ویرانوں سے ہٹ کر کلپنا جیسے روپ کی جیوتی کو اپنے آس پاس تلاش کرنا چاہا تو مجھے اپنے چاروں طرف ـــــ نیشا اور سلورنا جیسی ماڈل لڑکیوں کے ـــــ بے باک حسن کی پامال ـــــ دوشیزگی کے اڑتے ہوئے۔ غبار کے علاوہ ـــــ کچھ بھی ـــــ دکھائی ـــــ نہ ـــــ دیا" ـــــ وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا تو اس کی ڈبڈبائی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ـــــ اور گم سم بیٹھا عرشی سہمی سہمی نظروں سے دیال کو اس طرح دیکھتا رہ گیا جیسے وہ اسے چھیڑ کر اندر ہی اندر بری طرح کڑھ رہا ہے ـــــ...

عرشی نے اس حادثے کے بعد پھر کبھی دیال سے کچھ نہیں کہا اور وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ کم از کم اس کا مظلوم دوست اس مجسمہ کو بناتے ہوئے کلپنا کے اس دیرینہ غم سے تو چھٹکارا پالے گا جو اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے چلا جا رہا ہے ـــــ....

عرشی کچھ دن کے لئے اپنی بہن کے پاس دلّی چلا گیا اور وہاں دو ڈھائی مہینے گذارنے کے بعد کلا اسے لوکل ٹرین میں مل گئی تو ایک دوسرے سے مزاج پرسی کے بعد عرشی نے فوراً دیال اور اس کے مجسمہ کے بارے میں سوالات شروع کر دئے۔

" دراصل آپ کے دوست اور ان کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں عرشی صاحب وہ جتنے سیدھے سچے اور مہان کلاکار ہیں اتنے ہی رحم کے قابل ہیں ـــــ..."

کلا نے مسکراتے ہوئے اس تلخ حقیقت کا اظہار کیا تھا۔

" کیا وہ ـــــ مجسمہ بن گیا ـــــ؟"

" جی نہیں ـــــ میں خود بھی چاہتی ہوں کہ وہ مجسمہ بن جائے مگر وہ تو بس ـــــ

" خیر چھوڑیئے ـــــ آپ خود کوئی فلم کیوں نہیں بناتے ـــــ؟" اور پھر عرشی نے فوراً کلا کی بات کاٹتے ہوئے موضوع بدل دیا اور وہ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے

عرشی نے جیسے ہی دفتر جوائن کیا بھرار صاحب نے اسے ایک لمبا سا شڈیول تھما کر راجستھان کے تاریخی مقامات پر ایک ڈاکیومینٹری سیریل تیار کرنے کا حکم صادر کر دیا اس سے

لئے عرشی نے راجستھان کے اس طویل دورے پر جاتے ہوئے دیال کو ٹیلیفون پر مطلع کرنا چاہا تو پھر اس کا نوکر ہی بولتا ہوا سنائی دیا۔ "جی ہاں — صاحب اور کلا دیوی اسٹوڈیو میں ہیں کہیئے تو صاحب کو بلاؤں — ؟"

"نہیں رہنے دو — مجھے ابھی ٹرین پکڑنی ہے۔ اپنے صاحب سے کہہ دینا کہ میں کچھ دن کے لئے پھر — باہر جا رہا ہوں — واپسی پر ملوں گا —" اور وہ دیال کے نوکر کو ہدایت کر کے لوٹ پر چلا گیا —...

عرشی تقریباً دو ماہ بعد لوٹ کر آیا تو فلم کی ایڈیٹنگ میں مصروف ہو گیا۔ بوار صاحب اسے اپنے ایک سینیر اسسٹنٹ تلوار صاحب کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ہدایت کر کے منڈی ہاؤس دہلی چلے گئے۔ وہ دفتر میں بیٹھا شارٹ ڈویژن میں منہمک تھا کہ اچانک وہاں سے کلا آ دھمکی —

"ہلو — عرشی صاحب —" کلا نے اسے چہکتے ہوئے وش کیا تو وہ اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا —

ہلو — مس — شرما —" عرشی کی نظریں کلا کے پھول سے نکھرے ہوئے چہرے پر گڑ کر رہ گئیں تھیں اور کلا انتہائی گہرے میک اپ اور نیم عریاں لباس میں اس کے سامنے کھڑی کچھ زیادہ ہی بے باکی سے مسکرا رہی تھی —۔

"ہم نے تو سنا تھا آپ راجستھان کے طویل دورے پر ہیں — ؟"

"جی ہاں — پرسوں آیا تھا مگر — آپ تو یہ بتائیے کہ دیال اور اس کا مجسمہ۔"

"سوری مسٹر عرشی میں تو — آپ کے دوست سے پچھلے ڈیڑھ مہینے سے نہیں ملی۔"

"اور اس کا وہ مجسمہ — ؟"

"ہلو مس شرما —" تلوار صاحب نے آتے ہی کلا کو وش کیا تھا۔

"ہلو تلوار صاحب — کیا بانیا صاحب نہیں آئے — ؟" کلا نے تلوار صاحب کو دیکھتے ہی سوال کیا تھا۔

"جی نہیں — آج شوٹنگ نہیں ہو گی —"

"کیوں ـــــ کیا وہ خواب کے سین والا سیٹ تیار نہیں ؟" کلا عرشی کو بھول کر تلوار صاحب سے بتیانے لگی تھی اور عرشی اسے بھونچکا سا دیکھ رہا تھا۔

"وہ سیٹ تیار ہے مس شرما ـــ لیکن وہ اس سین کو فلمانے سے پہلے آپ سے ڈسکس کریں گے۔ آپ کو انھوں نے ابھی بنگلے پر یاد کیا ہے۔ وہ آپ کا وہیں انتظار کریں گے ؟"

"آل رائٹ ـ تھینک یو ـــ" کلا جانے کے لئے مڑی تو اسے معاً عرشی کا خیال آگیا۔

"سوری عرشی صاحب میں تو بھول ہی گئی کہ آپ کچھ کہہ رہے تھے ـــ"

"میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا ـــ کیا دیال کا وہ مجسمہ بن گیا ـــ" عرشی نے اپنا سوال دہرایا تھا۔

"شاید نہیں ـــــ" کلا نے دبے دبے لہجے میں کہا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ـــــ" عرشی مضطرب ہوکر بولا تھا۔

"ہوا یہ عرشی صاحب کہ مجھے باپنا صاحب نے اپنی نئی فلم "کالا گلاب" کے لئے سائن کرلیا اور اب ـــــ میں وقت نہیں دے پا رہی ـــــ ..."

"تو کیا آپ باپنا صاحب کی فلم ـــــ"

"جی ہاں ـــــ میں پچھلے دنوں اسی کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے مہابلیشور چلی گئی تھی ـــ"

"یہ تو آپ نے اس پر بڑا ستم کیا ـــــ"

"میں آج شام دیال صاحب سے ضرور ملوں گی' سنا ہے وہ بیمار ہیں آپ بھی شام کو وہیں پہنچئے ـــــ" کلا عجلت میں کہتی ہوئی دفتر سے باہر چلی گئی۔ تلوار صاحب بہت دیر سے انٹرکام پر کسی کو ہدایت دے رہے تھے اور افسردہ سا کھڑا عرشی صوفے میں دھنستا ہوا یہی سوچتا رہ گیا ـــ ....

"کیا یہ وہی کلا تھی جو کبھی اتنے شوخ بھڑکیلے میک اپ اور فلموں میں جسم کی نمائش کرنے والی اداکاراؤں کو حقارت سے دیکھتی اور ساہنی کے ہم خیال باپنا صاحب جیسے عورت خور

فلم سازوں پر کڑی نکتہ چینی کیا کرتی تھی ـــ....

کلا کے جاتے ہی عرشی کو دیال کی بے بسی کا خیال بری طرح ٹیس کرنے لگا، اس نے اپنی دن بھر کی مصروفیات کو مختصر کرکے ہوئے اپنا ضروری کام نمٹایا اور سورج ڈھلنے سے پہلے ہی ٹیکسی لے کر اسے دیکھنے روانہ ہو گیا ـــ....

"جانے وہ ـــ کیسا ہو گا ـــ اسے دیال سے آتے ہی ملنا چاہئے تھا۔ آخر وہ اس سے اب تک کیوں نہیں ملا ـــــ ؟" عرشی راستے بھر انھیں سوالوں سے الجھتا ہوا ایک انجانے سے خوف میں مبتلا دیال کی رہائش گاہ پہنچا تو اسے دیال کا نوکر مل گیا۔ عرشی نے اس سے دھڑکتے ہوئے دل سے دیال کے بارے میں پوچھا مگر اس کا بوڑھا نوکر رندھے ہوئے گلے کے باعث کچھ بھی نہ کہہ سکا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے عرشی کو دیکھتے ہوئے دیال کے اسٹوڈیو سے ملحق کمرے کی طرف اشارہ کرکے اپنے آنسو پونچھنے لگا ـــ....

عرشی گھبرایا ہوا سا پھرتی کے ساتھ سامنے والے کیبن میں داخل ہوا تو دیال آنکھیں بند کئے نڈھال سا مسہری کے تکیے پر اپنا سر ٹکائے نیم بے ہوشی کے عالم میں چپ پڑا تھا۔

"دیال ـــــ دیال ـــ" عرشی نے بڑھ کر اس کی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو دیال اسی طرح پڑے پڑے وحشت بھری نظروں سے عرشی کو گھورنے لگا ـــ.... اور عرشی نقاہت سے نڈھال اس کے زردی مائل چہرے کی مایوسی اور بڑھی ہوئی داڑھی دیکھ کر تڑپ اٹھا ـــ

"یہ تم نے ـــــ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے ـــ ؟" عرشی نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"کلا ـــــ چلی گئی ـــــــ" دیال کے خشک ہونٹ پھڑپھڑائے تھے۔

"جانتے ہو ـــــ تمہیں کتنا تیز بخار ہے ـــ ؟"

"کلا کے بنا وہ ـــ اسکیچ ـــــ ادھورا ـ ہے ـ عرشی ـ" دیال کراہا تھا۔

"وہ بھی ـــ بن جائے گا پہلے تم خود کو سنبھالو نہیں تو مر جاؤ گے ـــ"

"کلا ـــ کو ـــ لے آؤ ـــ"

"وہ ـــ اب نہیں آئے گی ـــــ" عرشی نے جھنجھلا کر کہا تو دیال نے اسے

پھٹی آنکھوں سے گھورا۔

" کیوں ___ نہیں آئے گی ___ ؟ "

" کیوں کہ اب وہ ___ باپنا کی نئی فلم " کالا گلاب " کی ہیروئن ہے۔

" کالا ___ گلاب ___ ؟ " دیال نے گردن گھما کر عرشی کی طرف دیکھا تھا۔

" ہاں ___ اور اب وہ اسی فلم کی شوٹنگ میں مصروف ہے اور باپنا کے بنگلے پر ___

" نہیں ___ تم جھوٹ بول رہے ہو " دیال کی اداس آنکھوں میں اچانک شعلے سے بھڑک اٹھے تھے ___ ..

" میں سچ کہہ رہا ہوں ___ وہ اب پہلے جیسی کلا نہیں، میں نے اسے آج انتہائی گہرے شوخ میک اپ اور بھڑکیلے مہین لباس میں پہلی بار اتنا بے تکلف اور بے باک دیکھا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس نے باپنا سے " کمپرومائز " کر لیا ہے۔

" کیا بک رہے ہو ___ ؟ " دیال نے ایک دم مشتعل ہو کر اٹھتے ہوئے عرشی کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

" ہوش میں آؤ دیال ___ " عرشی اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے جھنجھلایا تھا۔ " کلا کوئی پارسائی کا مجسمہ نہیں اسی دنیا کی شہرت زدہ لڑکی ہے اس لئے اسے تمہارا یہ تنگ و تاریک اسٹوڈیو نہیں خود کو چمکانے کے لئے ہیرے جواہرات کی چکا چوند کرنے والی روشنی چاہیئے۔ "

" کیا تم نے واقعی ___ کلا کو آج گہرے میک اپ اور بے باک لباس میں دیکھا ہے۔ "

" ہاں ___ وہ کل کی کلا سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ "

" اگر یہ سچ ہے عرشی تو اندر۔ اسٹوڈیو جا کر اس نامکمل مجسمہ کے ترشے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بتاؤ ___ کیا کلا کی آنکھوں میں ستاروں کی وہ دمک ___ اور چہرے پر حسن کی وہ پاکیزہ رمق ابھی تک باقی ہے جو اس مورتی کی آنکھوں اور ___ لب و رخسار سے جھلک رہی ہے ___ .. "

عرشی دیال کے مجبور کرنے پر کھڑا ہو گیا تھا اور تھکے تھکے قدموں سے اسٹوڈیو کی طرف بڑھ رہا تھا

عرشی حیرت زدہ سا مورتی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس قدِ آدم مرمریں مجسمہ کا صرف چہرہ تراشا گیا تھا جس پر آتش کدوں کی آگ کا مقدس نور دہک رہا تھا، آنکھوں میں ستاروں کی

سی دمک اور ہونٹوں پہ سجے موتیوں کی سی رمق جھلملا رہی تھی اور یہ سب کچھ دیکھ کر عرشی کو لگ رہا تھا جیسے پتھر کے اندر کوئی شمع روشن ہے جس نے اس مجسمہ کے تراشیدہ چہرے کو منور کر دیا ہے ـــــ دیال کے اس چمتکار کو دیکھ کر آج عرشی کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اپنے آس پاس کی ماڈل حسیناؤں میں کیا تلاش کر رہا تھا اور نیشہ دسلورنا کو نظر انداز کر کے جو کچھ اس نے کلا میں پایا تھا وہ نامکمل مجسمہ کے نیچے قدموں پر کندہ "دوشیزگی" کے عنوان سے نمایاں ہو کر دیال کے فن کی عظمت کا اعلان کر رہا تھا۔

عرشی مورتی کے اس تراشیدہ حسین چہرے کے سحر میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتے ہی مورتی کا طلسماتی سحر ٹوٹنے لگا۔

"کیا آج کی اس کلا کے میک اپ زدہ چہرے پر یہ مقدس نور، یہ اچھوتی رمق اور یہ پاکیزہ دمک ابھی تک باقی ہے جس سے اس مورتی کا چہرہ جگمگا رہا ہے ـــ؟"

عرشی ـــ کچھ ایسے ہی سوالات کے چبھتے ہوئے نشتروں کی نوک کو سہتا ہوا شکست خوردہ سا ـــــ دیال کی طرف لوٹ رہا تھا ـــــ اور جیسے ہی عالمِ خیال میں ڈوبا ہوا عرشی دبے دبے قدموں سے دیال کے کیبن میں داخل ہوا تو سامنے کھڑی کلا سے ٹکرا گیا۔

"تو کیا آپ ـــ اسٹوڈیو کے اندر تھے ـــــ؟" کلا کی آواز نے عرشی کو جگایا تو وہ کلا کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کے میک اپ کی تہہ میں چھپے دیال کے نامکمل مجسمہ کے عنوان کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا ـــــ....

"کمال ہے ـــــ آپ بھی مجھے اپنے دوست کی طرح بس گھورے ہی چلے جا رہے ہیں ـــ"

"آں ـــ" کلا کے ٹیس کرتے ہی عرشی نے چونکتے ہوئے دیال کی طرف دیکھا تو وہ دیوار سے کمر لگائے کلا کو اس طرح مسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنی کسی کھوئی ہوئی انمول شے کو ڈھونڈ رہا ہے ـ....

"دیکھئے نا ـــ" کلا کی پُرشکوہ آواز گونجی تھی ـــ "میں یہاں اتنی دیر سے کھڑی ہوں مگر آپ کے دوست بیٹھنے کے لئے نہیں کہہ رہے بس بھٹی بھٹی آنکھوں سے مجھے گھورے ہی چلے جا رہے ہیں ـــ...."

"نہیں —" عرشی دیال کی وحشت زدہ آنکھیں دیکھ کر بوکھلایا ہوا سا اس کی طرف بڑھا —... "دیال — دیال —" عرشی نے جیسے ہی آگے بڑھ کر اسے جھنجھوڑا تو دیال کا دھڑ اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر اس طرح جھک گیا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے — اور عرشی کو یہ دیکھ کر لگا جیسے دیال "کلپنا" کی "خوشبو کا گیت" گاتے گاتے زندگی کی حدوں سے بہت دور نکل گیا ہے —....

حل

نجمہ برکاتی

میں نے دل میں پختہ فیصلہ کر لیا ہے.......

اور اب میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے میری طبیعت کو سکون مل گیا ہے۔ کچھ دیر پہلے جو دل و دماغ میں ہیجان برپا تھا اور ایک قیامت کی اتھل پتھل مچی ہوئی تھی وہ جوالا مکھی کی طرح شانت ہو گئی ہے۔ جی ہاں اب میں گہری پرسکون نیند سو سکتا ہوں۔ اس وقت رات کے دو بجے ہوں گے۔ سارا عالم محوِ خواب ہے لیکن میں جاگ رہا ہوں۔ انسان بے چین و مضطرب ہو تو نیند اس سے روٹھ جاتی ہے۔ اچھا ہوا کہ میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ کل صبح جب میں اپنے فیصلے کا اظہار کروں گا تو سارے گھر میں ایک مسرت کی لہر دوڑ جائے گی۔ اماں فوراً دو رکعت نماز شکرانہ ادا کریں گی۔ طلعت باجی فوراً مٹھائی منگا کر تقسیم کریں گی اور آناً فاناً یہ خبر محلے بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی کہ ڈاکٹر طاہر حسین .... لیکن آئیے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں بتا دوں اور اُن حالات پر بھی روشنی ڈال دوں جو میرے فیصلے کی نوعیت کا بخوبی اندازہ کرا سکیں۔ آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں طاہر حسین ہوں۔ ابھی دو سال پہلے انگلینڈ سے ڈاکٹری تعلیم حاصل کر کے لوٹا ہوں۔ اگرچہ میں پرائیویٹ پریکٹس کرتا ہوں لیکن شہر کے سربرآوردہ ڈاکٹروں میں میرا شمار ہوتا ہے۔ کچھ خدا کا کرم و احسان سمجھئے یا پھر میرے طریقۂ تشخیص، علاج کا کرشمہ کہئے کہ ہر دل عزیزی اور مقبولیت نے میرے قدم چوم لئے ہیں اور چاروں طرف میرے

کلینک کی دھوم ہے۔ مریض جوق در جوق آتے ہیں اور مجھ سے مطمئن ہوکر جاتے ہیں۔ میرا قاعدہ ہے کہ شام کے وقت میں پانچ بجے کلینک پہنچتا ہوں اور رات کو ۹ بجے کرسی سے اٹھ جاتا ہوں۔ آج سے دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ سنیچر کی رات تھی دسمبر کی سرد اور برف میں ٹھٹھری ہوئی رات۔ ۹ بجے جیسے ہی میں گھر جانے کے لئے کھڑا ہوا میری نظر ٹیبل پر گئی۔ وہاں ایک ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ شاید کوئی مریض اسے بھول گیا تھا۔ میں نے اس وقت اسے کوئی اہمیت نہ دی اور یہ سوچ کر کہ اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنی چیزیں مختلف جگہوں پر بے خیالی میں بھول جاتے ہیں اور یاد آنے پر واپس لے جاتے ہیں، اس کو وہیں چھوڑ کر گھر روانہ ہو گیا۔ مگر اصل میں کہانی کا آغاز اسی ڈائری سے ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ میرے احساسات کی دنیا میں انقلاب لانے کی محرک یہی ڈائری تھی تو کوئی بیجا بات نہ ہوگی۔ ہاں تو میں آپ لوگوں کو بتا رہا تھا کہ ڈائری میں نے اس وجہ سے وہیں چھوڑ دی تھی کہ جو بھی مریض بھول گیا ہے وہ یاد آنے پر واپس لے جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ علاج و معالجہ کے سلسلے میں وہ دوسرے دن بھی آئے لیکن تین دن تک وہ بدستور ٹیبل پر پڑی رہی اور کوئی اس کی تلاش و جستجو میں نہیں آیا تو میرا تجسس جاگ اٹھا۔ میں نے ڈائری اٹھائی۔ اس کو کھول کر دیکھا۔ وہ ایک عام ڈائری تھی جیسی کہ پڑھے لکھے لوگ رکھتے ہیں۔ پہلے ہی صفحے پر صاحبِ ڈائری کا نام اور پورا پتہ درج تھا۔ جگہ جگہ حساب کتاب اور ضروری یادداشتیں لکھی ہوئی تھیں جو میرے لئے غیر ضروری تھیں۔ ڈائری کے اوراق کے بیچ میں کچھ اخبار کے تراشے بھی تھے۔ مجھے اشتیاق ہوا کہ سرسری نظر ان پر ڈالوں۔ اور کچھ ہی سیکنڈ میں میں نے وہ تمام اخبار کے کٹنگز پڑھ ڈالیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ سبھی سچی خبروں کے اخباری تراشے تھے لیکن موضوع اور مضمون سب کا ایک جیسا تھا۔ کچھ سرخیاں اس طرح تھیں جس سے آپ کو بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

"مناسب جہیز نہ لانے کے سبب ساس نے بہو کو زندہ جلا دیا۔"

"جہیز کی لعنت کا ایک اور شکار۔ لڑکی نے خودکشی کر لی۔"

"جہیز کے معاملے نے طول پکڑا۔ بارات واپس۔"

میں نے سبھی اخباری تراشے اسی طرح ڈائری میں رکھ دئے تھے جس ڈھنگ سے وہ سلسلہ وار رکھے تھے اور پھر گہرے خیالوں میں کھو گیا تھا۔ آخر ان اخبار کی کٹنگز کو اتنے اہتمام سے رکھنے کی کیا ضرورت تھی! یہ سوالیہ نشان میرے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ اب مجھے اس شخص سے ملنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ چوتھے روز میں ڈیوٹی ٹائم پر اس کے اسکول پہنچ گیا۔ وہ تھوڑی دور پر واقع ایک سیکنڈری اسکول میں مدرس تھا۔ اسٹاف روم میں وہ بڑی گرم جوشی سے ملا اور میرا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ میں نے اب اس شخص کو بغور دیکھا۔ جو ۲۷-۲۸ سالہ ایک صحت مند اور خوبصورت نوجوان تھا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ زمانے کے سرد و گرم تھپیڑوں نے اسے جھلسا کر رکھ دیا ہے تاہم اس کے ہونٹوں پر تھرکتی ہوئی مستقل مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ بڑے عزم و ارادہ کا آدمی ہے۔ آنکھوں میں بے پناہ ذہانت تھی مگر ان میں بھی ایک سیمابی کیفیت تھی جیسے کہ اضطراب اور بے چینی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہو' میں نے جب ڈائری نکال کر اسے پیش کی تو وہ حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا اور پھر تشکر آمیز لہجہ میں بولا "معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب! واقعی میں ڈائری کی وجہ سے کافی پریشان رہا لیکن اس کا مطلق دھیان نہ آیا کہ میں اسے آپ کے مطب میں چھوڑ آیا ہوں۔ آپ نے خاکسار کے لئے جو زحمت فرمائی اس کے لئے تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں۔" "اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے آپ ڈائری کی وجہ سے پریشانی میں ہوں" ...... میں نے جواب دیا تھا۔ اسٹاف روم میں ایک دو اساتذہ اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان کی موجودگی میں اخباری تراشوں سے متعلق دریافت کروں۔ یہ اس کا محل بھی نہ تھا۔ چائے وغیرہ سے جب ہم فارغ ہوئے تو میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے بولا۔

"اچھا تو جمال صاحب ملتے رہئے۔ اب تو ہم شناسا ہو گئے ہیں"۔ میں نے دانستہ طور پر یہ جملہ اس سے کہا تھا کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سے دوبارہ ملاقات کا امکان ختم ہو جائے۔ اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور اسکول کے صدر دروازہ تک

مجھے چھوڑنے آیا۔

دو چار ملاقاتوں میں ہم کافی قریب آگئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک مستقل مزاج اور حوصلہ مند شخص ہے۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ حالات اور زمانہ کی رفتار سے مطمئن نہ ہو۔ اکثر دورانِ گفتگو طنزیہ انداز میں وہ معاشرے اور رسم و رواج پر نشتر زنی کر جاتا تھا۔ آخر ایک دن میں اپنے دل کی خلش کو نہ روک سکا۔ ہم ایک چائے خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ " جمال صاحب! اگر بُرا نہ مانیں تو ایک بات دریافت کروں" ؟

" ارے ڈاکٹر صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ایک کیا دس باتیں دریافت کیجئے نا؟" وہ بے تکلفی سے بولا۔" دریافت تو مجھے پہلی ملاقات میں ہی کرنا چاہئے تھا مگر سوچتا رہا کہ کہیں آپ غلط تاثر نہ لے لیں۔" میں نے پھر کہا۔

" اب آپ پہیلیاں نہ بجھائیے اور سوال پوچھئے۔ خاکسار حاضر ہے۔" اس کے چہرے پر بدستور بشاشت کھیل رہی تھی۔" بہت معمولی سوال ہے مسٹر جمال۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنی ڈائری میں وہ اخباری تراشے کیوں اتنی حفاظت سے جمع کر رکھے ہیں"؟ " اوہ!" یہ سن کر وہ چونک سا پڑا۔ اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ اور چہرے پر اداسی چھا گئی مگر ایک لمحہ بعد ہی وہ زہرخند کے ساتھ بولا۔" ڈاکٹر صاحب! وہ تراشے نہیں بلکہ ہماری تہذیب کی ننگی تصویریں ہیں، ہمارے معاشرے کے ماتھے کا کلنک ہیں اور ہماری کھوکھلی اقدار کا کھلا ثبوت ہیں۔" وہ تھوڑی دیر رکا مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ اندرونی کرب میں مبتلا ہو۔ اس نے ایک ہی سانس میں چائے کا کپ خالی کر دیا اور خالی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔" ڈاکٹر صاحب! آپ نے میرے دل کے زخم کو پھر تازہ کر دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں اور نہ بھی جانتے ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے ہمارے سماج کی موجودہ رسوم سے نفرت ہے۔ ہمارا معاشرتی ڈھانچہ اس قدر گھناؤنا ہے کہ ہر ذی ہوش انسان اس پر لعنت بھیج سکتا ہے۔ جہاں امیر و غریب کے درمیان امارت اور دولت کی سدِ سکندری ہو، جہاں لڑکیاں جہیز کے نام پر سرِ بازار نیلام ہوتی ہوں اور جہاں شادی بیاہ کے نام پر

سود ے بازی کی جاتی ہو بھلا اس سماج میں مجھ جیسا عام انسان باعزت زندگی کیسے بسر کر سکتا ہے۔ یہ تراشے اس بات کے گواہ ہیں کہ سیکڑوں لوگوں کی بہنیں، بیٹیاں جہیز کے بلی دیوی پر قربان ہو جاتی ہیں۔ ...... شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں۔ مگر ڈاکٹر صاحب! جب انسان کے دل پر چوٹ پہنچتی ہے تو اس کے سینے میں سے لاوا کھول اٹھتا ہے اور اس کے جذبات میں ایک طوفان مچل اٹھتا ہے۔ آپ سننا چاہتے ہیں نا؟ سنئے! انھیں اخباری تراشوں میں ایک تراشہ ایسا بھی ہے جو میری معصوم بہن کی خودکشی کا افسانہ دہرا دیتا ہے ...... سسرال والوں نے جہیز کی کمی کو لے کر اسے اس قدر طعنے دئے کہ وہ مجبور ہو کر اپنی جان پر کھیل گئی۔ آہ میری فرشتہ صفت بہن! آج بھی جب اس کو یاد کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ دولت اور جہیز کے بھوکے گدھ اس کی لاش کو آج بھی نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں ...... میری بہن کی خودکشی کے صدمہ نے میرے والد کو نڈھال کر دیا اور وہ بھی کچھ دنوں بعد اسی غم میں چل بسے ...... میں اسی لئے یہ تراشے رکھتا ہوں کہ ہمارے معاشرتی نظام پر بہ ظاہر ہنس سکوں۔ اور تنہائیوں میں رو سکوں .... آپ جیسا ڈاکٹر بھی میرے غم کا مداوا نہیں کر سکتا ....." وہ چپ ہو گیا تھا اور میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف طور پر عیاں تھا کہ وہ ذہنی و قلبی اذیت سے دو چار تھا... میرے پاس کچھ کہنے کے لئے الفاظ نہیں تھے۔ اس کی داستان مختصر تھی مگر زندگی کا سارا زہر اس میں گھلا ہوا تھا۔ اس دن وہ مجھے ایک دوسرا شخص معلوم ہو رہا تھا۔ یہ وہ ہنس مکھ اور زندہ دل شخص نہیں تھا جو مجھے اسکول کے اسٹاف روم میں ملا تھا بلکہ شیکسپیر (Shakespear) کے کسی المیہ ڈرامے کا کوئی مثالی ہیرو دکھائی دے رہا تھا۔ میرے دل و دماغ پر بھی غم کی ایک کالی گھٹا چھا گئی تھی۔ بیس روز کے بعد آج پھر ہم اسی چائے خانہ میں ملے تھے۔ اس کی باتوں سے مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے پھر کسی وجہ سے اس کا زخم تازہ ہو گیا ہے۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے اس سے پوچھا تھا۔ "کہو بھئی گھر پر تو سب خیریت ہے"؟ وہ چونک گیا تھا اور پھر اجنبی لہجہ میں بولا تھا۔ "ہاں میرے گھر پر سب

خیریت ہے۔ امی جان بھی اچھی ہیں ... مسرت بھی اچھی طرح ہے اور میں بھی ــ مگر ڈاکٹر صاحب! آپ کو میرے گھر سے کیوں دلچسپی ہوگئی؟" "تم تو ناراض ہو رہے ہو! تم نے آج پھر اداسی اوڑھ رکھی ہے اس لئے بو سبیلِ تذکرہ پوچھ بیٹھا تھا۔" میں نے بہ مشکل کہا تھا "... اداسی اوڑھ رکھی ہے .... ہاہاہا" اس نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا تھا ....

"ڈاکٹر صاحب! بڑا شاعرانہ جملہ ہے ...... میں نے اداسی اوڑھ نہیں رکھی ہے بلکہ اداسیاں بانٹنے کا کام تو سماج کرتا ہے ...... چلو کیا یاد کرو گے ــ! آج کی اداسی کا سبب بھی بتا دیتا ہوں ــ! ڈاکٹر صاحب میرے پڑوس میں آج ایک شادی ہے۔ سیٹھ کریم بخش کے گھر۔ ان کی لڑکی سانولے رنگ کی پستہ قد ہے اور میٹرک فیل ہے۔ مگر چوں کہ لکھ پتی گھرانہ ہے اچھے جہیز کی امید میں ایک پروفیسر صاحب بڑی دھوم دھام سے گھوڑے پر بیٹھ کر آئیں گے اور دلہن کے ساتھ بہت کچھ لے جائیں گے .... اور تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے .... ابھی آپ نے میرے گھر کی بابت دریافت کیا تھا اس میں مسرت بھی رہتی ہے۔ میری دوسری بہن چندے آفتاب و چندے مہتاب ایم۔ اے۔ پاس کر چکی ہے اور اب عمر کی پچیسویں منزل میں ہے .... مگر بھاری بھرکم جہیز نہ ہونے کی وجہ سے ہر بار اسے ٹھکرا دیا گیا ہے........ سوچ رہا ہوں کہ اس موقع پر اس کے کیا تاثرات ہوں گے .... میں اس لئے اداس ہوں کہ آج اس کا دل اپنی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو روئے گا ..... میرے گھر کے برابر شہنائی گونجے گی' شادیانے بجیں گے لیکن وہ اپنی بدنصیبی پر نوحہ خوانی کرے گی .... مسرت بیچاری مسرت جس کے لئے شاید مسرتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں ...... دیکھئے ڈاکٹر صاحب! آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے چھوڑئے ان باتوں کو........"

کچھ دیر بعد بوجھل قدموں سے میں گھر لوٹ رہا تھا۔ میرے خیالات کی دنیا میں طوفان مچا ہوا تھا .... اماں نے ڈیڑھ سال سے شادی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ وہ میرے چہرے پر پھولوں کا سہرا اور گھر میں چاند سی دلہن دیکھنا چاہتی ہیں۔ مگر میرے پیہم انکار نے ان کے اصرار کے حوصلے پست کر دئے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کل

صبح میں اپنی شادی کی رضامندی ظاہر کردوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سن کو سارے گھر میں ایک مسرت کی لہر دوڑ جائے گی۔ اماں دو رکعت نماز شکرانہ ادا کریں گی۔ طلعت باجی فوراً مٹھائی منگا کر تقسیم کریں گی اور آناً فاناً یہ خبر محلے بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی کہ ڈاکٹر طاہر حسین شادی کے لئے تیار ہو گئے ہیں ..... گھر میں "اماں" سے صاف صاف کہوں گا کہ اگر وہ مسرت کے شادیانے بجانا چاہتی ہیں تو انھیں جیتی جاگتی "مسرت" کو گھر میں لانا ہوگا اور یہ بھی کہہ دوں گا کہ شادی بڑے سیدھے سادے ڈھنگ سے ہوگی۔ جہیز کے سلسلہ میں کوئی بات چیت نہ کی جائے گی اور سبھی معاملات میں اسلامی شعائر کو مدِ نظر رکھا جائے گا ..... ہاں میرا خیال ہے کہ ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے اس سے بہتر میرے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ اب میں آسانی سے سو سکتا ہوں ....!

—— ::: ——

(منی کہانیاں)

خوابوں سے پرے

(۱)

نذیر فتحپوری

"ماں! میری شادی کب ہوگی؟"

"جب تیرے ہاتھوں میں مہندی لگے گی۔"

"میرے ہاتھوں میں کب مہندی لگے گی ماں؟"

"جب تیری بارات آئے گی۔"

"میری بارات کب آئے گی؟"

"جب کوئی خوبصورت سا نوجوان تجھے پسند کر کے تیرا ہاتھ مانگے گا۔"

"لیکن کب پسند کرے گا مجھے وہ نوجوان؟"

"جب اسے جہیز میں دینے کے لئے ہمارے پاس ٹی۔ وی۔ ہوگا، اسکوٹر ہوگا اور بہت سارا بینک بیلنس ہوگا۔"

"لیکن یہ ساز و سامان ہمارے پاس کب آئے گا ماں؟"

"شاید کبھی نہیں۔"

"پھر وہ نوجوان؟"

"وہ بھی نہیں آئے گا۔"

"میرے ہاتھوں میں مہندی؟"

"کبھی نہیں لگے گی۔"

"ماں.......!"

"ہاں بیٹی سچ!"

خون کا رشتہ

(۲)

"کیا میں تمہارا بھائی نہیں ؟"

"کیا تم میرے بھائی نہیں ؟"

"کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے بھائی نہیں ؟"

"کیا ہم دونوں کی رگوں میں ایک ہی خون نہیں دوڑ رہا ہے ؟"

"کیا ہم دونوں نے ایک ہی ماں کی چھاتی سے دودھ نہیں پیا ہے ؟"

"کیا ہم دونوں ایک ہی آغوش میں نہیں پلے ؟"

"کیا ہمارا بچپن ایک ہی چھت کے نیچے، ایک ہی تھالی میں کھا کر جوان نہیں ہوا ؟"

"پھر جوان ہونے کے بعد ہمارے درمیان نفرت اور بے حسی کی دیوار کیوں کھڑی ہوگئی۔"

"ہم ایک دوسرے کے زخموں کی ٹیس محسوس کیوں نہیں کرتے ؟"

"کیا واقعی ہمارا خون سفید ہوگیا ہے ؟"

---

(۳)

چلتے چلتے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے ایک شہتیر نے اس کا راستہ روک لیا ہو۔ وہ رک گیا اور اس شہتیر کے بارے میں سوچنے لگا۔ جو ایک بلائے ناگہانی بن کر اس کے راستے کی دیوار بن گیا تھا۔ اسے راستے سے کیسے ہٹایا جائے؟ اچانک ایک منصوبہ اس کے ذہن کے کینوس پر ابھر آیا۔ اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے قدم بڑھائے۔ اس کے چلتے ہی شہتیر بھی چلنے لگا۔ وہ بوکھلا کر رک گیا۔ شہتیر بھی رک گیا۔ وہ پھر چلنے لگا۔ شہتیر بھی چلنے لگا۔ وہ پھر رک گیا۔ شہتیر بھی رک گیا۔ پسینے کی کچھ بوندیں جب اس کی پیشانی سے بہہ کر اس کی آنکھوں میں اتر آئیں تو اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آنکھیں ملنے کا عمل شروع کیا۔ آنکھیں ملنے کے بعد جب اس کی اپنی منزل کی جانب نظر اٹھائی تو شہتیر غائب ہو چکا تھا اور اس کی آنکھ کا تنکا ہتھیلی کی کسی لکیر میں دبا ہوا سسکیاں لے رہا تھا۔

(۴)

وہ بہت بڑا فنکار تھا۔
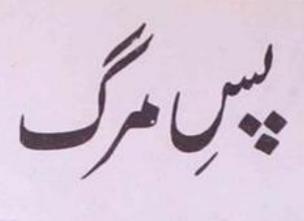
عوامی شہرت اس کی دہلیز پر سجدہ ریز تھی۔

جس زبان کا وہ شاعر تھا اس زبان کے رسائل و اخبارات اس کی تخلیقات سے عروج پاتے تھے۔ وہ شہر کے جس پس ماندہ علاقے میں رہتا تھا اس علاقے کا ڈاکیہ اپنی روزانہ کی نصف سے زائد ڈاک اس کی دہلیز پر انڈیل جایا کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بے حد عسرت کی زندگی جی رہا تھا۔

اس کے قلم کی نوک سے تخلیقات کا انبار لگ گیا تھا۔ لیکن اس کی اپنی کوکھ؟ وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ ابھی دو سال پہلے وہ اپنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات کا ڈھیر چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا تھا۔ اخبارات نے اس کی موت پر شہ سرخی لگائی تھی۔ ادبی رسائل نے سیاہ حاشیوں میں اس کی تعریف میں اداریے لکھے تھے۔ ٹی. وی. اور ریڈیو سے اس کی موت کا اعلان نشر کیا گیا تھا۔ اور اسے ملک کا بہت بڑا فنکار بتایا گیا تھا۔ لیکن اس کی شریکِ حیات کے پاس تعزیت کے لئے کوئی نہیں آیا تھا۔ اور پھر ایک سال بعد اس کی شریکِ زندگی بھی چل بسی تھی۔ جس کی آخری رسومات کے لئے پڑوسیوں نے چندہ کیا تھا۔

اور آج ریڈیو کی پہلی خبر نے بتایا کہ اسے حکومت کی جانب سے ملک کا سب سے بڑا انعام دیا گیا ہے۔

تخلیق کاروں کا تعارف

پروین خان

نام ۔ پروین خان

ولدیت ۔ عبدالقیوم خاں

جائے پیدائش ۔ ٹونک (راج)

سنِ ولادت ۔ ۱۵ مئی ۱۹۵۴ء

مشغلہ ۔ گورنمنٹ کالج میں کیمسٹری کی لکچرار

پتہ ۔ نذر باغ پیلیس ٹونک (راجستھان)

ڈاکٹر پروین خان گذشتہ چند سالوں سے سائنسی موضوعات پر مضامین ہندی اور اردو رسائل میں لکھ رہی ہیں۔ آپ کی تقاریر آل انڈیا ریڈیو جے پور سے اکثر آتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو میں بھی آپ افسانے لکھتی ہیں جو افسانہ اس انتخاب میں شامل ہے وہ ماحولیات پر ایک دلچسپ افسانہ ہے۔

حبیب کیفی

نام ۔ حبیب کیفی

جائے پیدائش ۔ سوجت سٹی، پالی (راجستھان)

سنِ ولادت ۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۴ء

تعلیم ۔ ایم۔ اے۔

پتہ ۔ ۱۵۹، ذاکر حسین کالونی، پانچویں چوپاسنی روڈ، جودھپور (راج۔)

اردو ہندی میں اب تک کوئی ڈیڑھ سو افسانے شائع ہو چکے ہیں افسانے ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہتے ہیں اور سامعین ان کو بہت پسند کرتے ہیں۔ آپ کے

افسانے اور کہانیاں اردو ہندی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہوئے ہیں۔

انایک ناول (ہندی) پر ۱۹۸۳ء میں "رانگےرانگھو" انعام ساہتیہ اکادمی نے دیا۔ ۱۹۹۱ء میں راجستھان اردو اکادمی نے اور ۱۹۹۳ء میں راجستھان وقف بورڈ نے ادب کی خدمت کے لئے آپ کو انعام سے بھی سرفراز کیا۔

"شراب گھر" اور "میں زندہ ہوں" ڈرامے اسٹیج ہو چکے ہیں۔ صفیہ ناول اردو میں راجستھان اردو اکادمی نے شائع کیا۔ اور انگریزی میں بھی اس ناول کا ترجمہ ہوا۔

بیسویں تاریخ (۱۹۸۸ء) اور پراجیت وجیتا (۱۹۹۳ء) افسانوی مجموعے دیوناگری میں شائع ہوئے۔ گمنا ناول جلد ہی منظر عام پر آرہا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے آپ کی الگ پہچان ہے۔

حسن جمال

نام ۔ حسن جمال

جائے پیدائش ۔ جودھ پور (راجستھان)

سنِ ولادت ۔ ۱۲ر اگست ۱۹۴۲ء

تعلیم ۔ ہائی اسکول

مشغلہ ۔ سرکاری ملازمت

شوق ۔ پڑھنا لکھنا

پتہ ۔ نزد پیا نواسں' لوہار پورہ جودھ پور

اردو میں بچوں کے رسائل "کھلونا" اور "پھول" وغیرہ میں آپ نے بہت کم عمری سے ہی لکھنا شروع کیا۔ کافی عرصے تک ہندی میں لکھتے رہے۔ پھر ۱۹۹۲ء سے اردو کی طرف راغب ہوئے اور آجکل اردو کے معروف رسائل میں برابر آپ کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہندی میں تین افسانوی مجموعہ چھپ چکے ہیں۔ بچوں کے لئے بھی

کئی کتابیں لکھیں۔ 'بالشت بھر درد' 'اناتھ' 'قرآن کی کہانیاں' اور بچوں کا ایک ناولٹ 'دیو کی دنیا' زیر طبع ہے۔

آپ کو گیان بھارتی (لکھنؤ)، راجستھان گوجویٹ ایسوسیشن بمبئی اور راجستھان وقف بورڈ جے پور کی طرف سے انعامات اور اعزاز دیا گیا۔

رئیس احمد عثمانی

نام	۔	رئیس احمد عثمانی
ولدیت	۔	قاضی انیس احمد عثمانی
جائے پیدائش	۔	جے پور (راجستھان)
سن ولادت	۔	سنہ ۱۹۵۹ء
تعلیم	۔	بی۔ اے۔
مشغلہ	۔	درس وتدریس۔ جواہرات سازی
شوق	۔	پڑھنا۔ خاص طور سے ابن صفی کے جاسوسی ناول
پتہ	۔	۴۶۲۲ ہادی پورہ چوکڑی رام چندرجی جے پور (راج)

رئیس احمد صاحب نے پہلا افسانہ اس وقت لکھا جب آپ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ علی باقر صاحب سے متاثر ہو کر آپ نے منی کہانیاں لکھیں۔ لطیف صاحب فہمی کے مشورہ پر کچھ عرصہ آسی رام نگری گورکھپوری سے اپنی کہانیوں پر اصلاح لی۔ سنہ ۱۹۹۰ء میں اقبال لائبریری رامپور (یو۔پی۔) کی جانب سے ایک انڈوپاک افسانوی مقابلہ میں آپ کی کہانی کو دس بہترین کہانیوں میں شامل کیا گیا۔

شاہد عزیز

نام ۔ عبدالعزیز خاں
قلمی نام ۔ شاہد عزیز
سنِ ولادت ۔ یکم ستمبر ۱۹۴۷ء
پتہ ۔ ۱۷۹ ار ملاح تلائی اودے پور (راجستھان)

۱۹۶۶ء سے برابر لکھ رہے ہیں۔ اظہار کا ذریعہ شاعری ہے۔ اس کے ساتھ ہی افسانہ نگاری کے میدان میں بھی آپ کے قلم کی روانی میں کسی طرح کی کمی نہیں مختصر کہانیاں آپ کی بہت مشہور ہوئی ہیں۔

شہناز فاطمہ رشید

نام ۔ شہناز فاطمہ رشید
ولدیت ۔ رشید احمد صدیقی
جائے پیدائش ۔ ٹونک (راجستھان)
سنِ ولادت ۔ ۲۳ ر ستمبر ۱۹۶۲ء
تعلیم ۔ ایم۔ اے۔ (اردو)
مشغلہ ۔ تعلیم و تدریس
پتہ ۔ قصرِ فیض محلہ رجبن۔ ٹونک (راج۔)

شہناز فاطمہ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۹ء سے کیا۔ آپ کا پہلا افسانہ "نیلا افسانہ" ۱۹۸۰ء میں بتول میں شائع ہوا۔ اور اس کے بعد لگاتار ہندوستان کے مختلف رسائل میں تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔ ماہنامہ بتول اور باجی کے افسانوی

مقابلوں میں انعام حاصل کئے۔ مختلف ادبی نشستوں اور سیمیناروں میں افسانے پڑھے۔ آل انڈیا ریڈیو جے پور سے افسانے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ "خواہشیں" اردو اکادمی کے تعاون سے شائع ہوا۔ آپ کے افسانے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن میں زیادہ تر معاشی الجھنیں نظر آتی ہیں۔ شہناز فاطمہ کے افسانے ان کے بہترین مستقبل کے ضامن ہیں۔

صادق بہار ٹونکی

نام	۔	محمد صادق خاں
قلمی نام	۔	صادق بہار ٹونکی
ولدیت	۔	محمد صدیق خاں
جائے پیدائش	۔	ٹونک (راجستھان)
سنِ ولادت	۔	۲؍ فروری ۱۹۳۹ء
تعلیم	۔	ایم۔ اے۔ (اردو) معلم۔ ادیب کامل۔ ہندی ساہتیہ رتن سنسکرت میں ساہتیہ وشارد
مشغلہ	۔	تعلیم و تدریس
پتہ	۔	نذر باغ پیلیس ٹونک (راج)

بہار ٹونکی نے علمی و ادبی ماحول میں تربیت پائی۔ اس لئے بچپن سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل رہے۔ اور گیارہ سال کی عمر میں ٹونک میں منعقدہ ایک آل انڈیا مشاعرے میں غزل سنا کر داد لی۔ بعد ازاں اردو میں شاعری کے علاوہ افسانہ، ڈرامہ اور مضامین لکھے۔ ۱۹۵۰ء میں "الجمیعتہ" میں کلام چھپا۔ نئی دنیا اور کئی ادبی رسائل میں آپ کے افسانے و مضامین چھپتے رہے۔ آپ کو لکھنے کا زیادہ شوق ہے اور شائع کروانے کا شوق بالکل نہیں ہے۔

کالج میگزین جب پہلی بار ٹونک میں "شت دل" کے نام سے چھپا تو آپ اس کے اسٹوڈینٹ ایڈیٹر تھے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ کا ڈرامہ "آنسو" اسٹیج ہوا۔ اور بہت پسند کیا گیا۔ آپ نے مسدس آئینۂ ٹونک "ٹونک کی منظوم تاریخ بھی لکھی جس کے کافی بند "بناس" نامی رسالے میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کا دیوان "سدابہار" اول غزلوں کا مجموعہ اور دوم نظموں کا مجموعہ ہے۔ آپ نے مولانا خنداں پو شخص و شاعر کے نام سے بھی ایک کتاب ترتیب دی ہے "موتیوں کا آبشار" شوکت علی خاں پو لکھی کتاب زیر طبع ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی بے شمار ہندی اردو کہانیاں اور مضامین ہیں۔

عارفہ سلطان

نام ۔ عارفہ سلطان

ولدیت ۔ سید محمد مختار احمد

جائے پیدائش ۔ بھوپال (ایم۔ پی۔)

سن ولادت ۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۴۷ء

تعلیم ۔ ایم۔ اے۔ (اردو)

مشغلہ ۔ صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ پی۔ جی۔ کالج ٹونک

پتہ ۔ رجبن ٹونک

بھوپال کے ادبی ماحول میں پرورش پائی جس کی وجہ سے شروع سے ہی ادب سے لگاؤ رہا۔ ۱۹۵۶ء سے لکھنا شروع کیا۔ کالج میگزین کے علاوہ سب سے پہلا افسانہ "انقلاب" میں چھپا۔ اس کے بعد بھوپال اور ہندوستان کے دوسرے اخبارات اور رسائل میں افسانے اور مضامین چھپتے رہے۔ کالج میں افسانہ نگاری کے مقابلے میں کئی بار انعامات ملے۔ راجستھان اردو اکادمی کی ممبر ۱۹۷۸ء میں پہلی بار بنائی گئی اور جب سے ہی یہ ذمہ داری کئی بار سونپی گئی۔ آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے ۱۹۷۰ء سے اردو میں مضامین

نشر ہوئے اور ۱۹۷۳ء کے بعد سے آکاش وانی جے پور سے برابر مضامین اور افسانے وغیرہ نشر ہو رہے ہیں۔

پانچ مونو گراف چھپ چکے ہیں۔

"عصمت چغتائی کی ناول نگاری" زیر طبع ہے۔

بورڈ آف اسٹڈیز ایم۔ ڈی۔ ایس۔ یونیورسٹی اجمیر کی ممبر ہوں۔ مختلف ادبی سوسائٹیوں کی ممبر ہوں۔ کئی سیمیناروں میں مقالات پڑھے۔

عالم شاہ خاں

نام	۔	عالم شاہ خاں
جائے پیدائش	۔	اودے پور (راجستھان)
سن ولادت	۔	۳۱ر مارچ ۱۹۳۶ء
تعلیم	۔	ایم۔ اے۔ (ہندی) پی۔ ایچ۔ ڈی۔
مشغلہ	۔	پروفیسر، صدر شعبۂ ہندی سکھاڑیہ یونیورسٹی اودے پور
پتہ	۔	۲۳ر آنگن چھایا، سندرواس نارتھ اودے پور (راج۔)

ڈاکٹر عالم شاہ خاں ہندی کے پروفیسر ہوتے ہوئے بھی اردو میں بڑے اچھے افسانے لکھتے ہیں۔ نخلستان کے پہلے شمارہ میں آپ کا افسانہ ۱۹۶۴ء میں "کانٹھ کا درد" کے نام سے شائع ہوا جو بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد مختلف اردو ہندی رسائل میں آپ کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ اب آپ زیادہ تر ہندی میں لکھتے ہیں آپ کے افسانے آکاش وانی سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر آپ کا ڈرامہ "پرائی پیاس کا سفر" دکھایا گیا۔ آپ کو ساہتیہ سرسوتی اعزاز دیا گیا۔ "رانگے راگھو" انعام سے بھی آپ کو نوازا گیا۔ آپ راجستھان یو۔پی۔ وغیرہ کی مختلف ادبی سوسائٹیوں کے اعزازی ممبر ہیں۔ آپ کے افسانوں میں دورِ جدید میں پیش آنے والے واقعات پر گہری تشویش اور ان کے افسوس ناک انجام پر گہرے دکھ کا اظہار ملتا ہے۔

عبدالمجید خاں

نام ۔ عبدالمجید خاں
ولدیت ۔ عبدالرشید خاں
جائے پیدائش ۔ ٹونک (راجستھان)
سن ولادت ۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۵۵ء
تعلیم ۔ ایم۔ اے۔ (اردو) بی۔ ایڈ۔
مشغلہ ۔ تعلیم وتدریس
پتہ ۔ نزد کھادی بھنڈار پائیگاہ موتی باغ۔ ٹونک (راجستھان)

عبدالمجید نے کچھ عرصہ پہلے ہی اردو میں افسانہ نگاری شروع کی ہے۔ ماہنامہ "باجی" اور دوسرے رسائل میں ان کی کچھ کہانیاں چھپی ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں انھوں نے اپنی ایک پہچان بنائی ہے اور مستقبل میں امید کی جاسکتی ہے کہ ایک اچھے افسانہ نگار کی شکل میں سامنے آئیں گے۔

عزیز اللہ شیرانی

نام ۔ عزیز اللہ شیرانی
ولدیت ۔ الحاج حافظ حکیم اللہ
پیدائش ۔ ٹونک (راجستھان)
سن ولادت ۔ ۱۵ر جون ۱۹۵۴ء
تعلیم ۔ ایم۔ اے۔ (اردو) بی۔ ایڈ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی
مشغلہ ۔ ریسرچ اسسٹنٹ آفیسر اڈلٹ ایجوکیشن ٹونک

پتہ . علی گنج بازار ٹونک (راج.)

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے ۱۹۶۲ء سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ پہلا مطبوعہ افسانہ "ٹھوکریں" ہے۔ اس کے بعد ملک کے مختلف جرائد میں آپ کے افسانے چھپتے رہے۔ آل انڈیا ریڈیو جے پور سے بھی آپ کے افسانے اور مضامین نشر ہوتے رہتے ہیں۔ بچوں کے لئے بھی کہانیاں لکھیں۔ جو راجستھان کے ثانوی نصاب میں شامل ہیں
" روداد آل انڈیا اردو کانفرنس " منعقدہ گورنمنٹ کالج ٹونک۔
" سنگِ زر " (افسانوی مجموعہ) " ادراکِ ادب " ٹونک کے ادیبوں کے افسانے اور مضامین کا انتخاب' آپ کی مطبوعہ تصانیف ہیں۔ "راجستھان میں اردو تعلیم کا جائزہ" کی اشاعت میں راجستھان اردو اکادمی جے پور نے مالی تعاون دیا۔
" راجستھان میں مختلف زبانوں کی کتابوں کے اردو تراجم " آپ کا پی. ایچ. ڈی. کا مقالہ ہے۔ آپ ٹونک کی مختلف ادبی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔

ضلع کلکٹر ٹونک نے اعلیٰ ادبی و سماجی خدمات کے صلہ میں جنوری ۱۹۹۴ء کو توصیف نامہ سے نوازا۔ بزم خوش دلان جودھ پور کی جانب سے آپ کی طنزیہ و مزاحیہ ادبی خدمات پر اعزاز دیا گیا۔ اور اسی سال راجستھان اردو اکادمی نے "بہترین استاد" کے اعزاز سے نوازا۔

عقیل شاداب

نام . عقیل احمد خاں
قلمی نام . عقیل شاداب
ولدیت . منشی محمد ابراہیم خاں
جائے پیدائش . کوٹہ (راجستھان)
سنِ ولادت . ۱۰ر جون ۱۹۳۵ء
تعلیم . انجنیئرنگ نامکمل

شغل ۔ پڑھنا لکھنا ۔ کاشت کاری (فارمنگ)

پتہ ۔ برج راج پورہ کوٹہ (راج.)

عقیل شاداب کوٹہ کے ایک پٹھان زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور اس کو نامکمل چھوڑ کر اپنے شب و روز اردو ادب میں تخلیقی کام کرنے کے لئے وقف کر دئے۔ سنہ ۱۹۵۰ء سے برابر لکھ رہے ہیں۔ ان کی شہرت یوں تو شاعری کے حوالے سے ہے لیکن ادبی موضوعات پر مضامین اور افسانے بھی لکھتے رہتے ہیں۔ باقاعدہ طور پر کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا۔ اپنے مذاق سلیم کی رہنمائی میں اپنا ادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

عمر جہاں صدیقی

نام ۔ عمر جہاں صدیقی

ولدیت ۔ محمد عمر صدیقی

جائے پیدائش ۔ ٹونک (راجستھان)

سنِ ولادت ۔ ۱۴ر جون سنہ ۱۹۵۶ء

تعلیم ۔ ایم۔ اے۔ (اردو) پی. ایچ. ڈی.

مشغلہ ۔ لکچرار (اردو) گونمنٹ کالج جھالاواڑ

پتہ ۔ منیر خاں کی مسجد رجبن ٹونک

عمر جہاں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کالج کے زمانے سے کیا۔ کالج میگزین کی ایڈیٹر بھی رہیں۔ افسانے اور مضامین جب سے ہی برابر لکھ رہی ہیں جو مختلف رسائل و جرائد میں چھپ رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو جے پور سے بھی آپ کے افسانے اور مضامین نشر ہوتے رہتے ہیں۔

ٹونک کی مختلف ادبی سوسائٹیوں کی ممبر اور نائب صدر ادبی سوسائٹی ٹونک ہیں۔ مختلف سیمینار میں اور ادبی محفلوں میں شرکت کرتی رہتی ہیں۔ اور ان میں مضامین و افسانہ بھی پڑھتی ہیں۔ آپ ہونہار افسانہ نگار ہیں۔ آپ سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں

فرزانہ خان

نام	۔	فرزانہ خان
ولدیت	۔	عبداللطیف خاں
جائے پیدائش	۔	ٹونک (راجستھان)
تعلیم	۔	ایم۔ ایس۔ سی۔ (M.M.B.)
مشغلہ	۔	ایمپلائمنٹ آفیسر
پتہ	۔	حویلی جنرل عبدالرحیم خاں بڑا کنواں ٹونک (راج۔)

ریاست ٹونک کی فوج کے اعلیٰ افسران جنرل عبدالرحیم خاں اور کرنل عبدالرزاق صاحب کے گھرانے کی چشم و چراغ مس فرزانہ خاں یوں تو ایمپلائمنٹ آفیسر ہیں لیکن اپنے سرکاری عہدے کی مصروفیات کے باوجود اپنے بزرگوں سے ملی ادبی و علمی ذوق کی تکمیل کے لئے وقت نکال لینا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب ان کے لئے زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے۔ آجکل پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے مقالے کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ "ٹونک میں روزگار" اور "ٹوٹتے پرویشن" کے نام سے دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہبی موضوعات پر چند مضامین شائع کروائے اور افسانوں کا مجموعہ "آخر کیوں" زیر طبع ہے۔

قیصر رشید بھارتی

نام	۔	قیصر رشید بھارتی
ولدیت	۔	صاحبزادہ حامد سعید خاں ساحل ٹونکی
جائے پیدائش	۔	ٹونک (راجستھان)
سنِ ولادت	۔	۱۱ر نومبر ۱۹۵۰ء
تعلیم	۔	ایم ۔ اے ۔ (اردو)
مشغلہ	۔	معلمی
پتہ	۔	اسٹریٹ شیر علی خاں، امیر گنج ٹونک (راج۔)

قیصر رشید بھارتی نے آنکھ کھولی تو اپنے چاروں طرف علم و ادب کے چرچے اور سرگرمیاں سننے اور دیکھنے کو ملیں۔ والد قادر الکلام شاعر، بھائی حامد رشید خاں، ایک مشہور افسانہ اور ڈرامہ نویس۔ چنانچہ زمانۂ طالب علمی۔ سے ہی اول شاعری پھر افسانہ نگاری کا شوق ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں جب ہند چین جنگ جاری تھی پہلی نظم کہی۔ آپ نے ماہر فنِ عروض صاحبزادہ محمد علی خاں عاجزؔ، حامد سعید خاں ساحلؔ اور عابد رشید خاں عابدؔ سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ آپ کے افسانے مختلف جرائد میں شائع ہوئے۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔ افسانوی مجموعے "در دانے" اور "کہکشاں سے بھارتی" شائع ہو چکے ہیں۔ ایک شعری مجموعہ "گلدستہ" شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ دو شعری مجموعے زیرِ طبع ہیں۔

مجیبہ حفیظ

نام	۔	مجیب النساء

قلمی نام ۔ مجیبہ حفیظ

ولدیت ۔ ماسٹر جمیل احمد صاحب

جائے پیدائش ۔ ٹونک (راجستھان)

سنِ ولادت ۔ ۲ مئی ۱۹۵۸ء

مشغلہ ۔ اسکول لکچرار

تعلیم ۔ ایم۔ اے۔ (اردو)

پتہ ۔ الہلال II 125/22، شاگرد پیشہ ٹونک

مجیبہ حفیظ کا پہلا مضمون "غالب کی عظمت میری نظر میں" رچیئل کالج اجمیر کے رسالے میں ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ پہلا افسانہ 'حسرت ان غنچوں پہ ہے' ماہنامہ ہمارا دور (دہلی) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک گاہے گاہے مختلف ادبی رسائل میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مختار الرحمٰن راہی

نام ۔ مختار الرحمٰن

قلمی نام ۔ مختار الرحمٰن راہی

جائے پیدائش ۔ جے پور (راجستھان)

سنِ ولادت ۔ یکم جون ۱۹۳۴ء

تعلیم ۔ بی۔ اے۔ ' ادیب کامل' ادیب فاضل۔ ایل۔ ایل۔ بی۔

پتہ ۔

مختار الرحمٰن راہی نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار جناب سید یٰسین علی صاحب سے حاصل کی۔ آپ کو طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر و ادب سے فطری لگاؤ ہے۔ ۱۹۵۱ء میں آپ کا پہلا افسانہ مہاراجہ کالج جے پور کے سالانہ میگزین سے

میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں ماہنامہ "بیسویں صدی" کے افسانہ نمبر میں آپ کی تخلیق "امتحان" کی اشاعت کے بعد آپ کی شہرت و مقبولیت بڑھنے لگی اور آپ کے افسانے مختلف رسائل و جرائد کے عام شماروں کے علاوہ خصوصی شماروں میں بھی شائع کئے جانے لگے۔

راہی صاحب نے چند ناول تقریباً ڈھائی سو افسانے چند رپورتاژ اور ریڈیائی ڈرامے تصنیف کئے۔ انگریزی ڈراموں کو اردو کا لباس پہنایا۔ اس کے علاوہ آپ نے ہندی میں بھی افسانے لکھے ہیں۔ ریڈیو پر آپ کے پروگرام نشر ہوتے رہے ہیں۔ آپ کی تخلیقات کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے۔ بیرونی ممالک میں بھی آپ کے افسانے پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

راہی صاحب نے اپنے آس پاس کے ماحول کو ہی اپنے افسانوں کا پلاٹ بنایا ہے اور اس کو زندگی کے حقائق اور عصری تقاضوں کی روشنی میں بڑے موثر انداز میں پیش کیا۔

مختار ٹونکی

نام	۔	سید مختار علی
قلمی نام	۔	مختار ٹونکی
ولدیت	۔	سید ممتاز علی
جائے پیدائش	۔	ٹونک (راجستھان)
سنِ ولادت	۔	۴ر اپریل ۱۹۳۹ء
تعلیم	۔	بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ۔
مشغلہ	۔	تدریس و تعلیم
شوق	۔	مضمون نویسی اور افسانہ نگاری

مختار ٹونکی کی افسانہ نگاری کا آغاز دورانِ تعلیم کالج میگزین سے ہوا.
اس کے علاوہ پہلا افسانہ "ملکۂ دولت" کے عنوان سے ۱۹۵۹ء میں ہفت وار پیام مشرق نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد متعدد افسانے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں جن میں خاتونِ مشرق' ایشیا' بیسویں صدی' نیا دور' جمناتٹ' نخلستان اور آجکل وغیرہ میں شامل ہیں۔ آکاش وانی جے پور سے بھی آپ کے افسانے نشر ہوتے رہتے ہیں.
او. ہنری اور چیخوف کے افسانے آپ کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ اردو میں سے آپ کرشن چندر سے متاثر ہوئے۔ آپ کا شمار سینیر قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ ٹونک ادبی سوسائٹی کے آپ صدر ہیں۔ آپ خود لکھنے کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ آپ کے طنزیہ مضامین اور افسانے بھی بہت پسند کئے جاتے ہیں آپ کی کتاب "ادٹ پٹانگ" شائع ہو چکی ہے۔
مختار ٹونکی نے منی افسانے بھی لکھے ہیں اور مضمون نگاری میں بھی کئی اعزازات حاصل کئے ہیں۔

معقول احمد ندیم

نام ۔ سید معقول احمد ندیم
ولدیت ۔ سید محمد احمد
سنِ ولادت ۔ یکم جولائی ۱۹۶۴ء
جائے پیدائش ۔ ٹونک (راجستھان)
تعلیم ۔ ایم. اے. (اردو) ایم. اے. (ہندی) جرنلزم
مشغلہ ۔ اسکول لکچرار (اردو)
پتہ

معقول احمد کو ادب کے مطالعے کا شوق ہے۔ اردو قلم کاری ان کی

زندگی کا اہم ترین مشغلہ ہے۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی اردو اور ہندی میں افسانے اور مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ "درد کے رشتے" کے عنوان سے افسانوں کا ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ ہندوستان کے مختلف رسائل میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو جے پور سے کئی افسانے اور مضامین نشر بھی ہو چکے ہیں۔ سید معقول احمد ندیم نوجوان ہیں کچھ کر دکھانے کے جذبے اور خوب سے خوب تر کی تلاش نے جو انھیں فعالیت بخشی ہے، وہ ان کے ایک شاندار مستقبل کی آئینہ دار ہے۔

ممتاز شکیب

نام ۔ ممتاز شکیب

جائے پیدائش ۔ مظفر نگر (یو.پی.)

تعلیم ۔ ایم. اے۔

مشغلہ ۔ اسسٹینٹ اسٹیشن ڈائریکٹر

پتہ ۔ آکاش وانی جے پور

ممتاز شکیب ۱۹۶۵ء سے ریڈیو اور رسائل کے لئے ڈرامے، افسانے اور خاکے (طنز و مزاح) لکھ رہے ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں۔ گذشتہ تین دہائیوں سے ملک اور بیرون ملک کے متعدد ادبی رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔

۱۹۷۱ء سے آکاش وانی سے منسلک ہیں۔ دہلی (اردو سروس)، بمبئی، بھوپال اور شری نگر (کشمیر) کے بعد اب آکاش وانی کے جے پور اسٹیشن پر اسسٹینٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔

راجستھان اردو اکادمی اور دیگر ادبی اداروں کے اعزازات کے علاوہ تحریر و پیشکش سے متعلق آکاش وانی (دلی) ایوارڈ سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔

راجستھان اردو اکادمی کی مطبوعات کی ترتیب و تدوین کا کام بھی انجام دیتے

رہتے ہیں۔ غرض اردو نظم و نثر کی دنیا میں ممتاز شکیب ایک معتبر نام ہے۔ ان کے افسانے اور ڈرامے حقائق اور مشاہدات پر مبنی دور حاضر کی مجموعی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔

ممتاز شکیب کا پہلا افسانہ "لاج" سویرا دہلی میں شائع ہوا۔ کرشن چندر، منٹو اور میکسم گورکی آپ کے محبوب ترین افسانہ نگار ہیں۔

نجمہ برکاتی

نام	۔	نجمہ برکاتی
ولدیت	۔	سید منظور الحسن برکاتی
جائے پیدائش	۔	ٹونک (راجستھان)
سن پیدائش	۔	۸ ر مئی ۱۹۵۴ء
پتہ	۔	منظور الحسن برکاتی شفا منزل ٹونک (راج۔)

نجمہ برکاتی نے اول قرآنِ کریم دینیات، اردو اور فارسی کی تعلیم دارالعلوم خلیلیہ ٹونک کے اساتذہ سے حاصل کی۔ عزیزیہ اسکول میں دسویں درجہ تک تعلیم حاصل کر کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یو۔پی۔) سے میٹرک پاس کیا۔ پھر عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں این۔ ایس۔ ڈی۔ ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے مولانا حکیم سید برکات احمد صاحب کی سوانح حیات اور علمی کارناموں پر تحقیقی مقالہ تیار کیا۔ اول اول اصلاحی کہانیاں لکھیں۔

مولانا/ سید قاضی الاسلام کے زیر تربیت افسانہ نگاری اور مضمون نگاری کی ابتداء کی۔ بعد ازاں محو نثار ٹونکی صاحب سے افسانوں پر اصلاح لی۔ ان کے افسانے مختلف رسائل میں شائع ہونے کے علاوہ آکاش وانی جے پور اسٹیشن سے بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔

نذیر فتحپوری

نام ۔ نذیر فتحپوری
جائے پیدائش ۔ فتحپور شیخاواٹی ضلع سیکر (راجستھان)
سنِ ولادت ۔ یکم دسمبر ۱۹۴۶ء
مشغلہ ۔ معمار سازی ۔ مساجد میں نقش و نگار کا کام
شوق ۔ ادبی کتب پڑھنا
پتہ ۔ مدیر اسباق ۲۱/۳ نیتا پارک ایروڈا پونہ

نذیر فتحپوری روزی روٹی کمانے کے لئے فتحپور سے بمبئی آئے اور یہیں کے ہو رہے ۔ آپ شعر و ادب سے قدرتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے آپ نے شاعری کی ابتداء کی ۔ کچھ عرصہ دلدار ہاشمی، عکس برنی اور عتیق احمد سے اصلاح لی۔ آپ شاعری کے ساتھ ساتھ ناول، افسانے اور منی افسانے بھی لکھتے ہیں۔ آپ نے چار ناولیں لکھیں۔ ادبی مضامین طنز و مزاح ڈرامہ نگاری، فلمی گیت، مکالمے بھی آپ لکھتے ہیں آپ کا پہلا افسانہ "خاتون مشرق" دہلی میں چھپا۔ اس کے بعد سے آپ کے افسانے ملک کے مختلف جرائد میں برابر چھپتے رہے ۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ "جستجو کا کرب" اور منی افسانوں کا مجموعہ "ریزہ ریزہ دل" بہت جلد چھپ کر آنے والے ہیں ۔